

طریقت و شریعت: ایک تعارف

(یہ مضمون جناب صلاح الدین ایوبی صاحب کی زیر طبع کتاب "طریقت و شریعت" کے تعارف کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں تفسیر قرآن کے قرآنی اصولوں اور دیگر کئی اہم نکات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، ایوبی صاحب کی اجازت سے یہ مضمون کچھ ترمیم و تبدیل کے ساتھ "طریقت و شریعت: ایک تعارف" کے عنوان سے اپنے قارئین کیلئے شائع کیا جا رہا ہے۔)

شریعت و طریقت: قرآنی نقطہ نظر بہت مشکل علمی موضوعات پر صلاح الدین ایوبی صاحب کی بہت اعلیٰ تحقیقی مساعی ہے۔ کوئی تحقیقی کام اعلیٰ ہوتا ہی نہیں جب تک وہ مصنف کی اپنی تلاش حق کی کاوش پر مشتمل نہ ہو۔ اس کتاب میں زیر بحث مسائل اور موضوعات، جناب صلاح الدین ایوبی کے اب تک کے تلاش حق کے سفر کا حاصل ہیں۔ ہم میں اور ایوبی صاحب میں قدر مشترک یہ ہے کہ ہم دونوں تلاش حق کے ایک ہی راستے کے مسافر ہیں اور ایک دوسرے کے اخلاص کے معرف کبھی۔ بظاہر ہم دونوں نے اپنے اپنے لئے بعض منتائج اخذ کرنے ہیں، بعض سوالوں کے جواب پالنے ہیں، لیکن ہم دونوں کا سفر ابھی جاری ہے۔ پہلے ہم اس سفر پر اکیلے اکیلے گامزن تھے، اب ایک دوسرے کو ساتھ لے کر چلنے کے متنبی ہیں۔ ہم دونوں کی الگ الگ تحقیقی مساعی ہمیں اس نتیجے پر تولے آئی ہے کہ "دین میں الحُقْ" ہونے کا، معیار حق ہونے کا مرتبہ صرف اور صرف قرآن پاک کو حاصل ہے۔ دین سے متعلق جو تصور، نظریہ، عقیدہ، فلسفہ، تفسیر قرآن کا اصول، تاویل حديث کا اصول، اجتہاد اور فقہ کا اصول، تشریح، تعبیر، نکتہ آفرینی، روایت، کشف، شہود وغیرہ 'الحق' کے مطابق نہیں، وہ حق نہیں۔ جو حدیث 'احسن العدیث' کتاب کے ساتھ ہم آہنگ نہیں اسکا حضور ﷺ سے انتساب درست نہیں خواہ وہ صحاح شیخ کی ساری کتابوں میں درج ہو۔ جس حدیث کی 'حدیث اصدق' کے ساتھ مطابقت رکھتی ہوئی تاویل ممکن نہیں، وہ حدیث حضور ﷺ کی فرمائی ہوئی نہیں ہو سکتی ہے شک وہ محدثین کرام کے طے کئے ہوئے روایت حدیث کے سارے اصولوں پر ہی کیوں نہ پوری اترتی ہو۔

اللہ نے قرآن پاک کو 'الحق' (معیار حق) فرمایا ہے۔ یہ معاملات دین میں سند یعنی اتھارٹی کا درجہ رکھتا ہے۔ 'افرقان' (حق اور ناحق میں فرق کرنے کی کسوٹی) فرمایا ہے۔ 'میزان' (اعمال کی قدر و قیمت کے تعین کا معیار) فرمایا ہے۔ کیا تفسیر قرآن کے کوئی ایسے حقیقی اصول ہیں جو خود قرآن پاک نے ہمیں دیئے ہوں تاکہ ہم سب بنیادی نکات پر یکساں متنبج اخذ کر سکیں! یقیناً ایسا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ یہ فرمارتا ہے کہ ہم نے اس میں کوئی کبھی نہیں رکھی۔ اس میں ہر شے کا بیان ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس کی آیات حکمت والی ہیں اور ایک دوسری کو مفضل کرتی ہیں۔ اس میں ہر شے کی تفصیل کھول کر بیان کر دی گئی ہے۔ اسے علم والوں کیلئے مفضل فرمایا گیا ہے۔ اسے علم الہی سے مفضل فرمایا گیا ہے۔ تو کیسے ممکن ہے کہ قرآن پاک نے خود اپنی تفسیر کے اصولوں سے ہمیں بے بہرہ رکھا ہو۔ قرآن پاک کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ ہر شے کے آپس میں تعلق کروشن کرتا ہے۔ (سورہ الحلق 16:64) تو کیسے ممکن ہے کہ اس میں حدیث پاک کے قرآن پاک سے تعلق کروشن کرنے کے اصول نہ دیئے گئے ہوں۔ سوال یہ ہے کہ پھر مفسرین کرام کا آپس میں اختلاف کیوں ہے؟ یہ فرقے کیے بن گئے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآنی اصولوں کو ملحوظ رکھنے کی صورت میں اپنی تجویز کو قرآن پاک میں داخل کرنے، حدیث اور روایات کو اللہ کے نازل کردہ کلام پر حکم (اتھارٹی) بنا کر من مانے عقائد اختراع کرنے، ظن، فلسفہ آرائی، نکتہ آفرینی اور اپنے عشق یا کشف و شہود کو حق کا درجہ دیکر دین میں داخل کر کے، دانستہ یانا دانستہ فرقہ سازی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ فتنہ پر دازوں کو یہ منظور نہیں ہوتا، امّت میں تفرقہ پیدا ہوتا ہے تو پڑے ہوتا رہے۔ حالانکہ

قرآن پاک تفرقہ کو گراہی سے بڑا جرم قرار دیتا ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین بناؤ کوہ طور پر گئے، ان کے پیچھے سامری نے پچھڑے کا ایک بت بنالیا۔ جب اس میں سے ہوا گزرتی، تو اس کے دھڑ سے گائے کے ڈکارنے کی مثل آواز لکھتی۔ سامری نے کہا یہ ہے تمہارا معبود ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا معبود، تو وہ اسے بھول گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کا ایک گروہ اس کے بہکاوے میں آگیا۔ واپس آکر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی سے سخت باز پرس کی کہ جب آپ نے انہیں گمراہ ہوتے دیکھ لیا تھا تو روکا کیوں نہیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے فرمایا: -- إِنَّى حَشِيبُ أَنْ تَتَوَلَّ فَرَّقْتُ بَيْنَ نَبِيِّ إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْكُبْ قَوْلِي۔ "بے شک مجھے یہ ڈر تھا کہ آپ فرمائیں گے، کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات یاد نہ رکھی۔" (سورہ طہ 20:85-94)

تفرقہ، اللہ کے دین سے بغاوت کا نتیجہ ہے۔

سورہ الشوریٰ میں ارشاد باری ہے: وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ -- "اور انہوں نے اپنے مابین

بغافت سے ہی تفرقہ ڈالا بعد اس کے کہ انہیں علم آپکا تھا۔۔۔" (سورہ الشوریٰ 42:13-14)

سورہ الانعام میں تفرقہ بازی کو مذکوب الہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا لَّيُضْلِلُوا عَنْ سَبِيلِهِ فُلْ تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى التَّارِیخ (سورہ

ابراهیم 30:14)

اپنے دین میں تفرقہ ڈالنے والوں کو مشرکین بتایا گیا ہے۔

ارشاد ہے: "— وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣﴾ مِنَ الَّذِينَ فَرَقُوا بَيْنَهُمْ وَكَانُوا شَيْعَاً كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدِيهِمْ

فَرَحُونَ ﴿١٤﴾۔۔۔ اور مشرکین سے نہ ہو جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا، اور گروہ گروہ ہو گئے۔ ہر گروہ اسی پر فرحت پاتا ہے جو اس کے پاس

ہے۔" (سورہ الرّوم 30:32-31)

دین کو قائم کرنا اور تفرقہ سے پچھا مشرکین کے لئے بھاری ہے۔

ارشاد ہے: كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا نَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ۔۔۔ (سورہ الشوریٰ 42:13)

تفرقہ پر داڑی کو اتنا بڑا جرم قرار دیتا ہے کہ سورہ الانعام میں ارشاد ہے کہ تفرقے میں مبتلا لوگوں کا نبی کریم ﷺ سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

ارشاد ہے: إِنَّ الَّذِينَ فَرَقُوا بَيْنَهُمْ وَكَانُوا شَيْعَاً لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ۔۔۔ جنہوں نے

اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور کئی گروہوں میں بٹ گئے، تمہیں ان سے کچھ سروکار نہیں۔ ان کا کام اللہ کے حوالے ہے۔۔۔" (سورہ الانعام

160:6)

تفرقہ میں نہ پڑنا اور یکسو ہونا امر الہی ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرُّوا۔۔۔ ﴿١﴾ اور سب جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کی رسمی کو مضبوطی سے خام لو، اور تفرقہ نہ

کرو۔۔۔" (آل عمران 3:103) یا ایّهَا الرُّسُلُ — وَإِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةٌ وَاحِدَةٌ وَأَنَا رَبُّكُمْ فَإِنَّقُولُونَ ﴿٢﴾ فَتَقَطَّعُوا

أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُراً كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدِيهِمْ فَرَحُونَ ﴿٣﴾ اے رسولو!۔۔۔ یہ تمہاری امت، امت واحد ہی ہے اور میں تمہارا رب

ہوں، تو مجھ پر ہی تقویٰ کرو۔ تو ان لوگوں نے امر کو اپنے مابین قطع کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ہر گروہ اسی سے فرحت پاتا ہے جو ان لوگوں

کے پاس ہے۔" (سورہ المؤمنون 23:52-53)

لوگ روشن نشانی کے باوجود تفرقہ میں پڑتے ہیں۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ "اور وہ لوگ [اہل کتاب] روشن نشانی کے آجائے کے بعد ہی

تفرقہ میں پڑتے ۔۔۔ انہیں امر یہی ہوا تھا کہ یکسو ہو کر اللہ کی بندگی کریں، خالص اسی کے دین کے ہو کر۔۔۔" (سورہ البیانہ 98:1-6)

بھلانی کے نام پر تفرقہ پر داڑی کیلئے ادارے بھی بنائے جاتے ہیں۔ ان سے واسطہ نہ رکھنے کا حکم ہے۔

بھلانی کے نام پر بھی ایسے مرکز بنائے جاتے ہیں، جن کا مقصد مومنین کو ضرر پہنچانا، حق کا انکار کرنا اور مومنین کے مابین تفرقہ ڈالنا ہوتا

ہے۔ ایسا مرکز بے شک مسجد کے نام پر بھی تعمیر کیا گیا ہو، وہاں نماز ادا کرنا منع ہے۔ ارشاد ہے: وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِداً

ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقاً بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ۔۔۔ لَا تَقْمُ فِيهِ أَبَدًا ط۔۔۔" اور وہ جنہوں نے ضرر پہنچانے، حق کا انکار

کرنے اور مومنین کے مابین تفرقہ ڈالنے کیلئے مسجد بنائی۔۔۔ آپ اس میں کبھی کھڑے نہ ہوں۔۔۔" (سورہ الشوبہ 107:9-108:1)

بھلائی کے نام پر ایسے مرکز بنانے کی ایک صورت 'دینی تحقیق' کے نام پر ادارے قائم کرنا بھی ہوتی ہے۔ مغربی جماعت کے تحت، مستشرقین کی سرکردگی میں، دنیا کے کئی ممالک میں، اسلام میں دینی تحقیق کے نام پر شاندار اسلامی مرکز قائم کئے گئے ہیں، جن میں باقاعدگی سے بین الاقوامی کانفرنسیں اور رکشاپس بھی منعقد کی جاتی ہیں، جو رواجی فرقہ وارانہ اختلافات کو فروغ دینے سے اور اٹھ کر، دین ہی کی بنیادوں کو متنازع بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان اداروں میں کام کرنے والوں کو شاندار ملی مفادات، بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی سہولیات اور مغربی جماعت میں تعلیم کیلئے وظائف بھی حاصل ہوتے ہیں، اسناد کی صورت میں شہرت و امتیاز سے بھی نواز جاتا ہے۔ مختلف ممالک کے مقامی اداروں کو بھی فنڈ زد کیر ساتھ ملا لیا جاتا ہے۔ بعض اوقات لوگ نادانست طور خلاف حق مقاصد کیلئے بھی استعمال ہو جاتے ہیں۔ بہر حال اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کو کسی اور موقع کیلئے اٹھار کھانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دین میں تحقیق کے نام پر، قرآن پاک کے حروف تو تبدیل کئے نہیں جاسکتے۔ البتہ 'کلام اللہ' کے الفاظ میں اپنی پسند کے معنی پیدا کرنے کو اپنی قابلیت سمجھنے والے، کئی طرح سے 'الحق' کو متنازع بنانے کے خلاف حق کام کے لئے استعمال ضرور ہو جاتے ہیں۔ اللہ انہیں ہدایت دے۔

اللہ نے انبیاء کرام کے ذریعے انکی امتوں کو وصیت فرمائی کہ دین میں تفرقہ نہ ڈال جائے۔ ارشاد باری ہے:۔۔۔ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَنَقَّرُوا فِيهِ ج۔ ٤٢ (سورہ الشوری: 13) ارشاد ہے: وَمَا تَنَقَّرُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعْدًا بَيْنَهُمْ ۔۔۔ (سورہ الشوری: 13، 14) لوگ علمی سے نہیں، علم آجائے کے بعد، فرمان الہی سے بغاوت کر کے ہی، تفرقہ میں پڑتے ہیں۔

ہمارے اور صلاح الدین الیوبی صاحب کے درمیان، الحمد للہ، اس بات پر اتفاق ہے کہ معاملات دین میں معیار حق کا درجہ صرف اور صرف قرآن پاک کو حاصل ہے۔ ہم دونوں فرمان الہی کے اتباع میں متن قرآن پاک کو عربی میں نامنتر ہیں اور کسی آیت پاک کے معانی متعین کرنے کیلئے 'لغت عرب' کے مقابل 'لغت قرآن' سے رجوع کرنے کو درست طریقہ سمجھتے ہیں۔ الیوبی صاحب کی زیر تعارف کتاب ان کے اس نظریہ کا عملی ثبوت ہے۔ قرآن پاک کے ہر تصور کا لغت قرآن کے مطابق صرف اور صرف ایک معانی متعین کر لینا، ان کا آئیندیل ہے۔ ہمارا نظریہ ہے کہ اگر قرآن پاک تحریری اسلوب میں نازل ہوا ہوتا، تو ہم یقیناً ان کے ساتھ اتفاق کر لیتے۔ لیکن قرآن پاک تو تحریری اسلوب میں نازل نہیں ہوا۔ یہ تو تحریری اسلوب میں نازل ہوا ہے۔ تحریری اسلوب میں نازل شدہ کلام الہی کو تحریری شکل میں مرتب ضرور کیا گیا ہے۔ تحریری کلام ہمیشہ وقت، مقام، حالات، مناطق اور پیغام کے حوالے سے قابل تشریح ہوتا ہے۔ تحریری کلام میں مقصد اہم ہوتا ہے، تحریری کلام میں مفہوم اہم ہوتا ہے۔ تحریری اور تحریری کلام اور مقصد اور مفہوم کے فرق کو واضح کرنے کیلئے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

سانحہ کر بلا معلی بنیادی طور پر سیدنا امام حسین علیہ السلام، اہل بیت اطہار کے نو خیز نوجوانوں اور ساتھیوں کی یزیدی فوجیوں کے ہاتھوں بے مثال دلیرانہ شہادت، اور خانوادہ رسول ﷺ کی پاک، با حوصلہ اور صابر بیسوں اور بچیوں کے بے یار و مدد گارہ جانے کی قیمت پر، سیدنا حضرت امام حسین کا یزید کی بیعت اطاعت سے انکار کرنا ہے۔

اور اصل سوال صرف یہ ہے کہ

"یزید کی بیعت اطاعت کر لینے میں کوئی ایسی چیز مانع تھی، کہ سیدنا امام حسین علیہ السلام نے کسی بھی قیمت پر یزید کی بیعت اطاعت نہ کرنے کا فیصلہ کیا، اور پھر مصائب و آلام اور خون کے سمندر سے گزر کر اپنے فیصلے پر بے مثال جراحت، عزم صیم، اور شجاعت کے ساتھ اس طرح پورا رہ کر دکھایا کہ قیامت تک اس کی مثال پیش کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔"

یہ چیز اقتدار کی طلب تو ہو ہی نہیں سکتی تھی، کہ اس صورت میں یزید کی بیعت اطاعت کر کے، اپنی اور خانوادہ رسول کی جانیں اور اہل بیت نبی ﷺ کی پاک بیسوں کو مصائب و آلام سے بچانے کے علاوہ، اعلیٰ سے اعلیٰ عبدہ حاصل کر لینا، اور اقتدار کے حصول کے لئے موزوں وقت کا انتظار کرنا ہی صحیح فیصلہ ہوتا۔

متفق لوگوں کا طریقہ ہر زمانے میں یہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ وہ اللہ کے فرمان کو پیش نظر رکھتے ہیں عمل کے ہر مقام پر۔ اللہ کے کسی فرمان کی اطاعت کے علاوہ، جو مانع تھا یزید کی بیعت اطاعت میں، اور کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی جناب سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کے اس عمل کی، کہ آپ کو کسی بھی قیمت پر یزید کی بیعت اطاعت کرنا قبول نہیں تھا!

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ کون سفرمان تھا جس کے پیش نظر، آپ کو یہ منظور تھا کہ سب کچھ قربان ہوتا ہے تو ہو جائے لیکن اللہ کے فرمان کی خلاف ورزی نہ ہوا!

قرآن پاک کی سورہ الکھف(18) میں ایک حکم ہے جو آپ علیہ السلام کے اس عمل کی تشریح کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

- وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْلَقْنَا قُلُبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ﴿١﴾ ”اور اس کی اطاعت نہ کر (1) جس کے قلب کو ہم نے اپنے ذکر سے بہت غافل کر دیا ہے، (2) وہ اپنی خواہشات کے اتباع میں لگا ہوا ہے، (3) اور ہر حد سے گذر گیا ہے۔“ (سورہ الکھف 18:28)

سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کے یزید کی بیعت اطاعت کرنے کے مقابلے میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے نیچے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو پورا یقین تھا کہ یزید میں یہ تینوں منفی صفات موجود ہیں، اور یزید کے بیعت کے مطالبے کو مانا، اللہ کے مذکورہ بالا فرمان کی نافرمانی ہے۔

حضرت امیر معاویہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بعد یزید کو سلطنت اسلامیہ کی امارت کیلئے نامزد کر کے تمام گورنزوں سے اس کے حق میں بیعت لے لی ہوئی تھی۔ سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کسی صوبے کے گورنر تھے اور نہ ہی آپ علیہ السلام نے یزید کی امارت کو کبھی چیلنج کیا تھا، نہ ہی آپ یزید کے مقابل حق امارت یا خلافت کے دعویدار تھے کہ آپ کو بیعت کیلئے مجبور کیا جاتا۔ نااہل کا احساس، نااہل حکمرانوں کو یہیشہ خوفزدہ رکھتا ہے۔ یزید کو اس کے ساتھیوں نے احسان دلایا تھا کہ پوری سلطنت اسلامیہ میں اس کے اقتدار کو چیلنج کرنے کا حقدار، اور حق امارت کا دعویدار، سیدنا امام حسین علیہ السلام سے زیادہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اگر سیدنا امام حسین علیہ السلام، اسکی بیعت کر لیں تو اس کے اقتدار کے لئے کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔ گورنر مدینہ کے ذریعے سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کو یزید کی بیعت کے لئے مجبور کیا گیا۔ سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کے قطعاً کوئی سیاسی عزم نہیں تھے۔ آپ کے کسی قول، عمل یا اقدام سے کبھی یزید کی حکومت کا تحفظ اللہ کے عزم کا اظہار نہیں ہوا۔ اقتدار کہیں آپ کو مطلوب نہیں تھا۔ ”اذا بھی پاک لوگوں کا مسئلہ نہیں ہوتی۔ یزید کی بیعت کر لینے میں اگر اللہ کا فرمان مانع نہ ہوتا، تو سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام اس میں ذرہ بھر دیرنا کرتے۔ آپ نے کوفہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ اہل مدینہ نواسہ رسول اور اہل بیت اطہار سے بیحد محبت کرتے تھے۔ آپ کی مدینہ پاک سے روائی، مدینہ پاک کو خون ریزی سے بچانے کیلئے تھی۔ مکہ شریف میں حج کے دن بالکل قریب تھے۔ تمام سلطنت اسلامیہ سے ہزاروں، لاکھوں عازمین حج جمع ہونے والے تھے۔ آپ علیہ السلام کا حج سے محض چند دن پہلے مکہ شریف سے کوفہ کیلئے روانہ ہو جانا، سلطنت اسلامیہ کو خانہ جنگی سے بچانے کیلئے تھا۔ سیدنا حضرت علی علیہ السلام کے دور خلافت میں کوفہ کو دارالخلافہ بنالیا گیا تھا۔ کوفہ میں سیدنا حضرت علی علیہ السلام اور اہل بیت میں محبت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کو یقین تھا کہ کوفہ پہنچ جانے کی صورت میں انہیں ایسی طاقتور پناہ میسر ہو گی، کہ یزید انہیں بیعت اطاعت کیلئے مجبور نہیں کر سکے گا۔ اور آپ وہاں اطمینان کے ساتھ معاملات دین میں ہدایت اور ہنماںی عطا فرمانے کا فریضہ ادا کر سکیں گے۔ مدینہ پاک سے روائی، مکہ شریف میں حج تک قیام نہ کرنے، اور حضرت مسلم بن عقیلؑ کے کوفہ بھیجے جانے سے سمیت، آپ کے ہر اقدام کا مشاصرف اور صرف یہی تھا کہ یزید کی بیعت کرنے سے بچا جا سکے کیونکہ ایسا کرنا امر اللہی ہے۔ - وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْلَقْنَا قُلُبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ﴿٢﴾ ”اور اسکی اطاعت نہ کر جس کے قلب کو ہم نے اپنے ذکر سے بہت غافل کر دیا، خواہشات کی پیروی کے علاوہ اسے کچھ کام نہیں، اور ہر حد سے گذر گیا ہے۔“ (سورہ الکھف 18:28) کی نافرمانی ہو گی۔ (سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کو باعی یا طالب اقتدار ثابت کرنے کے حوالے سے تمام روایات، یہ امیہ کی اپنے دفاع میں گھٹری ہوئی ہیں، یا سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کے یزید کی بیعت اطاعت سے انکار کی وجہ کا، درست اور اک نہ کر سکنے پر مبنی ہیں۔)

بات ہو رہی ہے تقریری اور تحریری کلام اور مقصد اور مفہوم میں فرق کی۔ سورہ الکھف کی محلہ بالا آیت پاک کے مفہوم کا بہت سے لوگوں کو پہنچتا ہے۔ سیدنا امام حسین علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کو شہید کرنے والوں کو بھی پہتھا، لیکن اس تقریری کلام کے ذریعہ موقع محل کی مناسبت سے یہ امر اللہی ان سے کیا تقاضا کر رہا ہے، اس بات کا ادراک صرف سیدنا امام حسین علیہ السلام ہی کو تھا۔ یہ مقصد محض لغت عرب یا لغت قرآن کو جان لینے سے آشکار نہیں ہوتا۔

اگرچہ کلام اللہ کے حوالے سے حضور ﷺ کے فوری مخاطب تو اس زمانے کے اہل عرب ہی تھے، لیکن قرآن پاک کا پیغام تو آفاقی اور دائی ہے۔ پھر یہ پیغام فرد کو بھی مخاطب کرتا ہے اور جماعت کو بھی۔ قوم سے بھی خطاب کرتا ہے اور اقوام عالم سے بھی۔ یہ کبھی صیغہ واحد حاضر (تو) کے ذریعے موجودہ اور آنے والے زمانوں کے ہر فرد سے فرد افراد خطاب کرتا ہے اور کبھی صیغہ واحد غائب (انے) میں خطاب کر کے حضور ﷺ کے کسی مخلص محبت کی تبلیغ کا واسطہ کے نقص کی اصلاح کرتا ہے اور نام کو اختفاء میں رکھ کر اسکی عیب پوشی کرتے ہوئے، اصلاح اور عیب پوشی کا علم عطا کرتا ہے۔ کلام اللہ کے حکم کا اقتضاء فرد سے اور ہوتا ہے، جماعت اور قوم سے اپنے اپنے درجے کے مطابق اور ہوتا ہے۔ اس کا کوئی حکم ایسا نہیں، اسکا کوئی پیغام ایسا نہیں جس میں آفاقیت نہ ہو، دوام نہ ہو۔ محض لغت قرآن پر اکتفا کر لینے سے آپ اس الہامی پیغام کی عالمگیریت اور دوام کو آشکار نہیں کر سکتے۔ کلام الہی کے دائی طور پر قبل عمل رہنے کیلئے لازم ہے کہ اس کی تفہیز کے طریقے میں وقت، مقام، مقدار کی مناسبت سے بدل سکنے کی گنجائش موجود ہو۔ لغت سے تحریر کا صرف مفہوم متعین ہوتا ہے۔ تقریری کلام میں مقصد اہم ہوتا ہے۔ ایوبی صاحب نے 'شریعت اور طریقت' سے متعلق تصورات اور اصطلاحات کا لغت قرآن کی مناسبت سے جس طرح جائزہ لیا ہے ہم اسے بہت قدر سمجھتے ہیں۔ ہمارا احساس ہے کہ اگر تفسیر قرآن کے قرآنی اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے اور لغت قرآن کو کلام الہی کی مقصدیت کے حوالے سے متعین کیا جائے تو ان تصورات کی وضاحت زیادہ احسن طریقے سے کی جاسکتی ہے۔ ہم تفسیر قرآن کے اصولوں کو بیان کر کے، انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے ایوبی صاحب کی منتخب بعض اصطلاحات کے مفہوم کو 'مقصد قرآن لغت' کے مطابق مزید واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

تفسیر قرآن کے قرآنی اصول

1. قرآن پاک 'الحق' ہے۔ قول کی حیثیت سے معاملات دین میں سند (معیار / اتحاری)، فرقان اور میزان کا درجہ رکھتا ہے۔

وَيَرَى الَّذِينَ أُنْوَا الْعِلْمَ الَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ هُوَ الْحَقُّ وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ﴿١﴾ اور جنہیں علم عطا ہوا ہے، وہ دیکھتے ہیں، کہ جو آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے، وہی حق ہے، اور عزت والے حمد والے کی راہ سمجھاتا ہے۔" (سورہ سا 34:6) مزید حوالے: إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ ... (النساء 105:4) وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ... فَلَا حُكْمُ بَيْنَهُمْ إِمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ ... (سورہ المائدہ 5:48) ... قَوْلُهُ الْحَقُّ ... "اسی کا قول الحق ہے۔" (سورہ الانعام 6:73) قول، عمل، علم اور اخلاص درجے ہیں۔

قرآن پاک قول ہے۔ (إِنَّهُ لَقُولُ رَسُولٍ كَرِيمٌ ﴿٤١﴾ وَمَا هُوَ بِقُولٍ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَا ثُوَّمُونَ ﴿٤٢﴾ (الحاقة 40:69-41) جو اللہ کی طرف رجوع لارہا ہو (یعنی شاپد / مخلص) کے اتباع میں اس پر عمل کرنے کا حکم ہے۔ (وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنْابَ إِلَيَّ ﴿٣١﴾ سورہ القمان 31:15)

عمل کے بعد حاصل ہونے والی کیفیت کا نام علم ہے۔ علم کے مقام سے بولنے کا حکم ہے۔ (اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر عمل نہیں کرتے۔ اللہ کے نزدیک یہ نہایت بیزاری کی بات ہے کہ تم وہ کہو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے۔ (سورہ العفاف 61:3) قرآن پاک قول کی صورت میں اللہ کا نازل کردہ 'الحق' ہے۔ قول کے معنی ہیں تعلیم، ہدایت، رہنمائی، اصول، سند اور اتحاری۔ قرآن پاک کے حوالے سے بات کرنا، سند (authority) کے ساتھ بات کرنا ہے۔ حال پر صرف قرآن پاک ہی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ فرمایا گیا ہے: وَالَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ ... اور جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب سے نازل ہوا وہ 'الحق' ہے۔" (سورہ الرعد 13:1) مزید حوالوں کیلئے دیکھنے (آل عمران 3:60) (البقرہ 2:147)

قرآن پاک کلام اللہ ہے۔

تضاد سے پاک ہونا اسکی شان ہے۔

حتمی اور دائی ہے۔

مطلق طور پر محفوظ ہے۔

شک و شبہ سے پاک ہے۔

اس میں ہرشے کی تفصیل کھول کر بیان کر دی گئی ہے۔ (سُوكِلَ شَيْءٍ فَصَلَّنَاهُ تَقْصِيلاً ﴿١٢﴾ سورہ الاسراء 12:12)

ہرشے کے آپس میں تعلق کروشن کرتا ہے۔ (سورہ الحلق 64:16)

افراد کے درمیان روابط کے استحکام کا علم عطا کرتا ہے۔)

ظاہری و باطنی نعمتوں کی تکمیل کی توپتی کرتا ہے۔ (الَّمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعْمَةً ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ﴿20﴾ سورہ لقمان 31:20)

الحق کے مقابل بال طلب نہیں سکتا۔)

قرآن پاک فرقان ہے۔ حق اور ناقص قول میں فرق کے اعتبار سے سند / اتحاری / کسوٹی کا درجہ رکھتا ہے۔
اعمال کی قدر کے تعین کی میران ہے۔

باطل، الصَّلَال، لغو، ظُنْنٌ یعنی قیاس گمان، افتراضی، اور فوت، بغیرِ الحَقِّ (یعنی شر) کی مختلف صور تیں ہیں۔

قرآن پاک حتمی اور دائیگی ماذ خدا شریعت ہے۔ جسکو سنبھالنے، جمع و تدوین، قرأت، بیان اور حفاظت کی ذمہ داری خود اس کے نازل فرمانے والے علم مطلق نے لی ہواں سے بڑی حفاظت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ علم مطلق سے فرمائے ہوئے کلام الٰہی میں، شک شہبے اور ظُنْن گمان قیاس کا کوئی مقام ہی نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک قول کے اعتبار سے مطلق صداقت ہے۔ یہ احسن الحدیث کتاب ہے۔ احسن الحدیث کتاب میں تضاد کا پایا جانا ممکن ہی نہیں۔ جو ہرشے کا خالق مطلق ہے، اسی کا کلام ہرشے اور تفصیل کا احاطہ کر سکتا ہے۔ قرآن پاک سمجھ رکھنے والوں کیلئے آسان ہے۔ (سورہ التمر 54: 17) قرآن پاک میں آیات کو دہرا یا گیا ہے۔ ایک جگہ دعویٰ ہے تو دوسرا جگہ اسکی شہادت ہے۔ نصیحت ماننے والوں کیلئے اس میں ہر شی کی تفصیل ہے۔ (سورہ الانعام 6: 127) اس کتاب کو علم والوں کیلئے منفصل فرمایا گیا ہے۔ (سورہ الاعراف، 7:32) اس کتاب کو علم سے منفصل فرمایا گیا ہے۔ (سورہ الاعراف 7: 52) حضور اقدس ﷺ پر نزول قرآن کا مشایخ بیان کیا گیا ہے کہ آپ روشن کر دیں جس بات میں یہ اختلاف کریں۔ (سورہ الحُجَّة 16: 64) یہ قرآن سب سے سید ہی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔ (سورہ الانعام 6: 115) قرآن عربی وہ کتاب ہے جس میں علیم مطلق نے کسی چیز کی کی نہیں چھوڑی۔ یہ حضور ﷺ کی محض داستان انذار ہی نہیں، بشارت اور انذار دونوں پر مشتمل ہے، (فضائل / حُمُّ السُّجُود 4:41، 3)

قرآن پاک کی یہ صفات ایسی ہیں جو سب کی سب کسی اور قول، تعلیمات، اصول، معیار میں سیکھنیں پائی جاتیں، اور ان کی وجہ سے صرف اور صرف قرآن پاک کو ہی معیار حق ہونے کے اعتبار سے سند / اتحاری کا درجہ حاصل ہے۔ اسی بنیاد پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو نظریہ، عقیدہ، توپتی، تاویل حدیث، پریکش، ارشاد، قول، گمان، خیال، احساس، وہم، تصور، تخيّل، تاثر، وجدان، واردات، حال، کشف و شہود کی تشریح اور تعبیر، تفسیر قرآن، متشابہات کی تاویل، کلمتہ آفرینی، اور خود تفسیر قرآن کا اصول، قرآن پاک کے ساتھ ہم آہنگ ہو وہ حق ہے۔ جو متناقض ہو وہ باطل ہے۔ قرآن پاک جس کو روا کرتا ہے، وہ بغیرِ الحق ہے۔ (البقرہ 61: 41، فضائل 15: 2، نافر / مومن 40: 75، یوں 10: 23، الاعراف 33: 7، 146: 33) تصدیق سے خالی بات محض رائے، قیاس، گمان یا ظُنْن کا درجہ رکھتی ہے، اور ظُنْن کسی کو حق سے مستقیع نہیں کر سکتا۔ (سورہ یونس 10: 36) جس بات کا کوئی حاصل نہ ہو، وہ لا حاصل بات ہی لغو ہوتی ہے۔ شوکت نفس کے لئے کلمتہ آفرینی بھی لغو گوئی کی ایک صورت ہے۔ لغو بات مومن کے شایان شان نہیں ہوتی۔ (سورہ المؤمنون 3: 23) ذات باری، اسکی صفات کریمہ اور اسما الحسنی کے بارے میں ایسا تصور، تشبیہ، تمثیل، اسلوب گنتگا اور فلسفہ، یار و حانی تجربہ کی ایسی تعبیر جس کی تصدیق قرآن پاک سے نہ ہوتی ہو، اللہ پر افتری باندھنا (concoction) ہے، اور اللہ پر افتری نہ باندھنے کا حکم ہے۔ (سورہ ہود 11: 18، سورہ النساء 4: 71) حکم الٰہی ہے: ”... اور اللہ پر نہ کہو مگر حق ...“ (سورہ النساء 4: 171) فرمان الٰہی سے اخراج الصلال ہے۔ فرمایا گیا ہے: الحق کے بعد ہے ہی کیا مگر مگر اسی۔ (یوں 10: 32، الحج 28: 53) قرآن پاک کے مقابل نظریات باطل ہیں۔ (بنی اسرائیل 17: 81) فرمان الٰہی کو اپنی خواہش کے مطابق بنانا فست ہے اور اللہ فاسق ہی کو گراہ کرتا ہے۔ (البقرہ 26: 2)

عربی زبان کی صرف و نحو کے اصول نہ حقی ہیں نہ دائیگی، نہ ہی شکوک و شہباد سے پاک۔ انہیں کلام الٰہی کے معنی متعین کرنے کیلئے، جو حقی بھی ہے اور دائیگی بھی، اور شک سے پاک بھی، معیار سمجھنا قطعاً بے جا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام فرقوں کے بانی اور جید علماء عربی زبان و ادب، اسلوب و محاورہ، گرامر اور صرف و نحو میں ملتی ہونے کے دعوے دار ہونے کے باوجود کبھی ایک منفرد تفسیر قرآن تک نہیں پہنچ سکے۔ تفسیر قرآن میں اختلاف اور تضاد سے محظوظ رہنے کیلئے لازم ہے کہ

تفسیر قرآن پاک کے اصول خود قرآن پاک سے لئے جائیں۔

قرآن پاک کی صرف و نوحود قرآن پاک کی عربی میں سے اخذ کی جائے، لغت عرب اور دور جاہلیت کے عربی ادب کے مقابل لغت قرآن کو اخذ کیا جائے، اور ایسی لغت قرآن کو ترجیح دی جائے جو مقاصد قرآن کو واضح کرتی ہو۔ تاکہ قرآنی تصورات کے حقیقی مقتضاء اور مقصد کو پایا جاسکے۔ (مثلاً افہم کے معنی اللہ کے کلام میں اپنی تجویز داخل کرنا لغت عرب سے لے جائے ہیں نہ دور جاہلیت کے عربی ادب سے۔)

اللہ تعالیٰ نے متن قرآن کے عربی میں میں ہونے کی سند نازل فرمائی ہے۔ حسن کلام کا معیار اگر قرآن پاک سے باہر دیکھا جائے گا، عربی میں کوئی لغت قرآن کے مقابل لغت عرب سے سمجھنے کی کوشش کی جائے گی، تو غیر معیاری سے معیار کو جانچے، بے سند کو پر کھنے کے متادف ہو گا۔ فرمان الہی۔۔۔ **اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ**۔۔۔ جو اللہ نے نازل فرمایا، اس کا اتباع کرو۔ (البقرہ: 170) کے حکم سے باہر نکل جانے والی بات ہو گی۔ ممکن ہی نہیں کہ ایسی کوشش تضادات کا شکار نہ ہو۔

قرآن پاک میں تدبیر کرنے کا حکم ہے۔

ارشاد ہے: **كِتَابُ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ مُبَارَكٌ لِيَدْبَرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ** ﴿١﴾ "یہ کتاب مبارک ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمائی ہے، کہ لوگ اس کی آیات میں تدبیر کریں اور عقل والے نصیحت مانیں۔" (سورہ ص: 29:38)

قرآن پاک میں تدبیر کی صورت یہ ہے کہ حکم خداوندی کو تضاد سے پاک مانا جائے اور اللہ کے فرمان پر عمل کیا جائے۔ مانے کے بعد جانے کا جو مقام آئے گا، اسے علم کہتے ہیں۔ مانے سے پہلے جانے کی حقیقت قول ہوتی ہے۔

قرآن پاک کے بغیر حق کا پہنچ ہی نہیں لگ سکتا۔ باطل اس میں دخل ہی نہیں پاسکتا۔ یہ حقیقت اور دلائلی ہے۔

قرآن پاک اتنی بلند پایہ کتاب ہے، کہ باطل اس میں دخل نہیں پاسکتا، نہ اس میں سابقہ روایات آسکتی ہیں، نہ اس میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ ارشاد باری ہے: **لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ** ﴿٢﴾ "باطل اس میں دخل نہیں پاسکتا۔ اس کے آگے سے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ حکیم و حمید کی طرف سے نازل فرمائی گئی ہے۔" (نحل: 42:41) یہ وہ یقینی علم ہے جو ہر مقام پر پورا رکھنے اور تضاد سے بچانے میں بے بد نعمت ہے۔

کسی خاص خلیٰ یا زمانے کیلئے نہیں بلکہ عالمیں (the whole humanity) کیلئے رہنمائی ہے۔

ارشاد باری ہے: **إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ وَلَتَغْمُنَّ نَبَأً وَ بَعْدَ حِينَ** ﴿٣﴾ "یہ تو عالمیں کے لئے نصیحت ہے۔ اور ضرور ایک وقت کے بعد تمہیں اس خبر کا علم ہو جائے گا۔" (سورہ ص: 38:87-88) مزید ارشاد ہے: "اور ہم نے قرآن کو ذکر کے لئے آسان بنادیا ہے تو ہے کوئی نصیحت پانے والا۔" (آل القمر: 54:17) پھر ارشاد ہے: **سَمَا فَرَطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ** ۔۔۔ "ہم نے کتاب میں کسی شے کی کمی نہیں چھوڑی۔" (سورہ الانعام: 6:38) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: "اور ہم نے آپ کو ہر شے کی تفصیل تجھیوں پر لکھ دی، تو انہیں قوت سے تھامئے، اور اپنی قوم کو امر دیجیئے کہ اسے اچھی طرح تھامیں۔۔۔" (سورہ الاعراف: 7:145)

معیار مستند نہ ہو تو کسی شے کے معیاری ہونے کا فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

معاملات دین میں تجھیں وطن سے کبھی یقینی علم تک نہیں پہنچا جاسکتا۔ قرآن پاک 'الحق' ہے۔ معاملات دین میں سند (authority) کا درجہ صرف اور صرف قرآن پاک کو حاصل ہے۔ (سaba: 34:6) یہ بات تفسیر قرآن کے اصولوں پر بھی ویسے ہی عائد ہوتی ہے جیسے دیگر معاملات پر۔ جب قرآن پاک کے اپنے دعوے اور ہمارے ایمان کے مطابق قرآن پاک میں ہر شی کی تفصیل، ہر معاملے میں رہنمائی، ہر شے کا آپس میں تعلق اور "ظاہری و باطنی" نہیں کا ذکر موجود ہے تو کیا قرآن پاک اپنی تفسیر کے اصول نہیں دیتا؟ یقیناً دیتا ہے لیکن مفسرین کرام نے اپنے مزاج، پسند، علمی پس منظر اور زمانے کے مطابق تفسیر قرآن کے اصول خود وضع کرنے کو ترجیح دی ہے۔ ہمارے علم کے مطابق (سوائے تفسیر فاضلی کے جو سات منازل پر مشتمل ہے اور 1982ء سے 1998ء کے دوران شائع ہوئی ہے) پوری اسلامی تاریخ میں ایک بھی تفسیر قرآن ایسی نہیں ہے جو پوری کی پوری "تفسیر قرآن بالقرآن" ہو۔ ارشاد باری ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ﴿٤﴾ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو، اور تفرقے میں نہ پڑو۔ (آل عمران: 3:103)

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے جو ہمیں تفرقے میں پڑنے سے بچا سکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ تفسیر قرآن کے اصولوں سمیت، قول کی صورت میں ہمارے ہر کام کی سند قرآن سے پاک سے ہو۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کو حقیقی اور دلائلی کے طریقے کو عمل کی حقیقت نظری

(precedent) مانا جائے۔ حکم پر عمل کا طریقہ وقت، مقام اور مقدار کی مناسبت سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ احادیث مبارکہ کی روشنی میں حال پر حکم الہی (قرآن پاک) پر عمل کے موزوں تین طریقے کی تشكیل ہماری تحقیقات کا مقصود ہونا چاہیے۔ تفرقة اور نفرتوں کا قلع قمع اسی صورت ممکن ہے۔ جس طرح آیات متشابہات کی تاویل کیلئے لازم ہے کہ وہ حکمات سے ہم آہنگ ہو، اسی طرح حدیث پاک، تاریخی شواہد اور روایات کی تعبیر، تاویل اور صرف دخوکے اصولوں کیلئے لازم ہے کہ وہ بھی 'احسن الحدیث کتاب' کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ عربی حکم ہے، حدیث پاک اس عربی حکم کی تاویل، تفصیل اور تفہیم ہے۔ حکم دائری ہے۔ تفہیم حکم کے طریقے کا وقت، مقام، مقدار اور استطاعت سے مناسبت اختیار کرنا ہدایت کے دوام اور عالمگیریت کا لازمی تقاضا ہے۔ قرآن پاک حکم ہے، مأخذ شریعت ہے۔ حدیث پاک تفہیم حکم کی نظیر (precedent) ہے۔ قرآن پاک قول ہے، حدیث پاک عمل ہے اور فتح علم ہے۔ اگر حدیث پاک کو تفہیم حکم کی نظیر نہ مانا جائے، حتیٰ اور دائیٰ مأخذ شریعت مان لیا جائے، تو فتحہ پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اگر فتحیہ مکاتب فکر کو حتیٰ اور دائیٰ مان لیا جائے تو وقت، مقام، مقدار کی مناسبت سے اجتہاد کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

ہمارا قوی احساس ہے کہ مسلم فکر اور تہذیب کے تمام مسائل اور ترقہ کی بنیاد 'تفسیر قرآن' کے قرآن پاک سے متناقض اصولوں میں پائی جاتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ 'تفسیر قرآن بالقرآن' میں ہی مسلم فکر کے تمام مسائل کا حل، تفرقة کا خاتمه اور اتحاد بین المسلمين کی بنیاد ہے۔ 'تفسیر قرآن بالقرآن' ہی 'تفسیر قرآن کا بہترین اسلوب اور مقصد القرآن لغت' ہی قرآن پاک کی اصل لغت ہے۔

2. آیات قرآن پاک کی حکمات اور متشابہات میں تقسیم اور متشابہات کی تاویل کا لازماً حکمات پر استوار ہونا۔

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ "وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی۔

مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمٌ اسکی کچھ آیات حکمات ہیں۔

هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وہ ام الکتاب ہیں۔

وَأُخْرُ مُتَشَابِهَاتٌ طَ

فَإِنَّمَا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ رَayْعٌ

فَيَسْتَيْعُونَ مَا تَشَابَهَ وَ مِنْهُ

إِنْتِعَاءَ الْفِتْنَةِ

وَابْتِعَاءَ ثَلَوِيلِهِ

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ

وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ لَا كُلُّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا

اور علم میں راسخ حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس پر۔ سب ہمارے رب کے پاس سے ہے۔

وَمَا يَذَكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے۔" (سورہ آل عمران 3:7)

اس آیت پاک میں 'الکتاب' کی تمام آیات کو دو قسموں میں تقسیم فرمایا گیا ہے۔

ایک وہ جو بر اہ راست احکام کی شکل میں ہیں، یہ حکمات ہیں۔ دوسری وہ، جن کے پڑھ لینے سے اور سن لینے سے ان کے بیان کے مطابق ہم پر حق

عامد ہو جاتا ہے، یہ متشابہات ہیں۔

اہم الکتاب کا درجہ حکمات کو حاصل ہے، کہ ہر فیصلے میں معیار یہی حکمات ہیں۔ متشابہات سے جو نتیجہ بھی اخذ کیا جائے، حکمات سے اس کی تصدیق ضروری ہے۔ اس آیت پاک میں متشابہات کی تاویل کا اصول یہ عطا کیا گیا ہے کہ حکمات پر استوار کر کے اکنی توضیح کی جائے گی۔ ورنہ اس نتیجے کی صحت کا کوئی ثبوت نہ ہو گا۔ جن لوگوں کے قلوب میں بھی ہوتی ہے وہ حکمات، جو اہم الکتاب ہیں، کی پرواد نہیں کرتے۔ متشابہات کیلئے معنی کا تعین کرتے ہیں، مگر اپنی خواہش نفس کے مطابق۔ قرآن پاک انہیں فتنہ پرور کہتا ہے۔

متشابہات کی تاویل کا حقیقی علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ کتاب کی تمزیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اسلئے پوری کتاب کو مانا لازم ہے۔ علم میں جن حضرات کو راجح ہونے کا شرف ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے۔ یہ سب ہمارے اللہ کی طرف سے ہے، اسلئے کہ رسول امین نے اسی طرح فرمایا ہے۔ یہ صاحبان عقل ہیں کیوں کہ اللہ کی نصیحت کو مانتے ہیں۔

جو اللہ کی نصیحت کو نہیں مانتے، فرمانِ الہی میں اپنی قیاس آرائیاں اور خواہشات داخل کرنے کیلئے تباہات کی من مانی تاویل کرتے ہیں۔ ان کے قلوب میں کبھی ہے۔ کوئی نئی بات کر کے، تفرقہ کو ہوادیکر، اپنے لئے امتیاز (distinction) ملاش کرنا چاہتے ہیں۔ فتنہ پر لوگ ہیں۔ چونکہ اللہ کی نصیحت کو ملحوظ نہیں رکھتے، اس لئے فرمانِ الہی کے مطابق یہ عقل و ایسے نہیں ہیں۔

سورہ الزمر 39 آیت نمبر 23 میں فرمایا گیا ہے: "اللَّهُ نَعَمْ أَحْسَنُ الْحَدِيثَ كَتَبَ 'نَازِلَ فِرْمَائَيْ'، إِيَّاكَ حَسِينَ، دَهْرَيْ بَيَانِ وَالِّي...'" احسن الحدیث کتاب 'کا' ہم رنگ 'ہونا لازم ہے۔ 'ہم رنگ' کلام وہی ہوتا ہے جو تضاد اور اختلاف سے پاک ہو۔ اس میں بیانات کو اس طرح دہرایا گیا ہو کہ اس سے نور ہدایت بڑھے۔ ایک جگہ اگر دعویٰ ہو تو دوسری جگہ اس کی شہادت ہو۔ اللہ نے قرآن پاک کے احسن الحدیث کتاب 'ہونے کی سند نازل کی ہے۔ 'احسن الحدیث کتاب' میں نہ تضاد ہو سکتا ہے نہ اختلاف۔ اس کی آیات ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ تناقض نہیں ہوتیں، مطابق ہوتی ہیں۔

تبباہات کی تاویل، حکمات پر استوار کر کے کی جائے، قرآن پاک کے کم از کم دو مقامات اس تعبیر کی توثیق کریں، اپنی تعبیر کیلئے حتمیت کا دعویٰ نہ کیا جائے، اقرار کیا جائے کہ ان کی تعبیر کا حقیقی علم اللہ ہی کو ہے، تو قرآن پاک کو تضاد اور اختلاف سے پاک 'احسن الحدیث کتاب' مانے کا دعویٰ سچا ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی کو محترم ملک شمس الدین صاحب 'مقصد قرآن لغت' کا نام دیتے ہیں اور تقریباً 2009 سے یہ لغت مرتب کرنے کے کام میں مصروف ہیں۔

3. تضادِ فکر، جو کہ تفرقہ کی جڑ ہے، تکذیبِ حق کا نتیجہ ہوتا ہے۔

بلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَرِيجٍ ﴿٥٥﴾ "بلکہ انہوں نے حق کی تکذیب کی ہے جب وہ ان کے پاس آچکا ہے، تو وہ تضادِ فکر میں الجھے ہوئے ہیں۔" (سورہ ق 5:50) اللہ کا فرمان سند کا درجہ رکھتا ہے، اور فرمانِ الہی ہے: "حق کے بعد ہے ہی کیا، مگر گمراہی۔" (سورہ یونس 10:32) مطابق حق ہونا، فکر کی طبعی صورت ہے۔ تضادِ فکر غیر طبعی صورت ہے۔ تضادِ فکر، تکذیبِ حق کا حاصل ہوتا ہے۔

(ا) "الْحَقُّ ہو نا اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ کلام قرآن مجید کا نام ہے، اللہ تعالیٰ 'الْحَقُّ' نہیں بلکہ 'الْحَقُّ' کا نازل فرمانے والا ہے۔"

ارشاد باری ہے: وَالَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ۔ اور جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب سے نازل ہوا وہ 'الْحَقُّ' ہے۔" (سورہ الرعد 13:1) اور سورہ محمد میں ارشاد ہے: ... بِمَا نَزَّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ۔ ﴿٤٧﴾ "محمد ﷺ پر جو نازل فرمایا گیا ہے، وہی ان کے رب کی طرف سے 'الْحَقُّ' ہے۔" (سورہ محمد 47:02) 'الْحَقُّ' اور 'اس کا نازل کرنے والا' دونوں ایک نہیں ہو سکتے۔ صدیوں پہلے یہ تضادِ فکر پیدا ہوا۔ بعض مکاتبِ فکر نے فرقہ وارانہ مقاصد کیلئے اسے بڑھایا۔ 'الْحَقُّ' اور 'اس کے نازل کنندہ' میں عینیت قائم کرنے سے تفسیر قرآن میں بھی مزید تضادات پیدا ہوئے ہیں۔ اس کا نسبتاً تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

(ب) انسان 'خَلِيفَةُ اللَّهِ فِي الْأَرْضِ' نہیں ہے۔ اللہ پاک ہے اس بات سے کہ کائنات کے کسی حصے میں کوئی اس کا خلیفہ، نائب، قائم مقام یا جانشین ہو۔ انسان کو اللہ نے 'فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةٌ' بنا کر بھیجا ہے۔ (وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً۔ ﴿٣٠﴾ سورہ البقرہ 2:02) (مزید حوالے، سورہ یونس 10:14، سورہ ح 38:26) خلافت کی حقیقت اختیار ہے۔ جس کا منشایہ ہے کہ زمین پر موجود تمام توفیق کو حق کے مطابق استعمال میں لا جائے، لوگوں کے درمیان حق کے مطابق حکم کیا جائے، اور زمین پر انفرادی، اجتماعی اور میان الاقوامی سطح پر خواہش کی پیدا وی کو راجحہ ہونے دیا جائے۔)

(ج) قرآنِ الحکیم کبھی سے پاک ہے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوْجَا ﴿١٨﴾ "حمد اللہ ہی کی ہے، جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل فرمائی اور اس میں کبھی نہ رکھی۔" (سورہ الکہف 18:1) کبھی سے پاک، احسن الحدیث کتاب کی تعبیر میں امت مسلمہ میں پائے جانے والے اختلافات، تضادات، الجھاؤ اور تفرقہ کی بنیاد صرف اور صرف تفسیر قرآن کے قرآنی اصولوں سے صرف نظر کے علاوہ کسی اور چیز میں نہیں پائی جاسکتی۔

(د) قرآن پاک اور حدیث کی تاویل میں تعلق اور حدیث کی تاویل کے قرآنی اصول۔

الله تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ (هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ۔ سورہ افغان 48:02) یہ گمان کر کی بات یا عمل ہدایت اور دین حق کے علاوہ کبھی کچھ ہو سکتا ہے، قطعاً خلاف حق ہے۔ آپ کے قول اور عمل فرمانِ الہی کے

مطابق ہونے کے حوالے سے معیار اور سند کا درجہ رکھتا ہے۔ حدیث پاک حضور نبی پاک ﷺ کے قول یا اعمال کے حوالے سے آپ سے منسوب روایات ہیں۔ ان روایات پر مشتمل کتب کی جمع و تدوین نبی پاک کے تبعین نے اپنے علم و تقویٰ اور حضور پاک سے اپنی محبت کی بنیاد پر کی ہے۔ قرآن پاک حضور نبی پاک ﷺ ہی کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ متن قرآن، محض آپ ﷺ سے منسوب روایت نہیں ہے۔ قرآن پاک سورتوں کے اس مجموعے اور آیات کی اس ترتیب کا نام ہے جس کی شہادت نبی کریم ﷺ نے دی، شاہدین جس کی شہادت دیتے چلے آرہے ہیں اور قیامت تک دیتے رہیں گے۔ نبی پاک کی شہادت، اور شاہدین کی شہادت سے ہم اس کے متن کا 'کلام اللہ' (Word of God) ہونا، تحریف سے پاک حقی اور دائی مأخذ شریعت ہونا، معاملات دین میں قول کی صورت الحق ہونا، اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہونا، اور اسکی جمع و تدوین اور قرأت کا علم الہی کے مطابق ہونا منتہی ہیں۔ کلام پاک اپنے آپ کو 'احسن الحديث کتاب' بھی کہتا ہے اور یہ بھی ارشاد باری ہے:- **وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا** ﴿٤﴾۔ اللہ سے اصدق حدیث کس کی! (کسی کی نہیں)۔ (الناء 4:87) عقائد سے متعلق احادیث، عقائد کی توضیح اور تشریح ہوتی ہیں۔ عقائد سے متعلق حدیث جس کی 'حدیث اصدق' کی محکمات کے ساتھ ہم آہنگ تاویل نہ ہو سکے، اس کا حضور ﷺ سے انتساب قطعاً درست نہیں ہے بلکہ کیسے ہی متعین اور تقریر راوی سے اسکا مردی ہونا کیوں نہ ثابت ہو۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ تنقید احکام الہی سے متعلق صحیح احادیث، مأخذ شریعت کی محکمات سے متناقض ہوں۔ معلم کتاب و حکمت ﷺ سے منسوب حکیمانہ اقوال کا حکمت قرآنیہ سے متناقض ہونا ممکن نہیں۔ جس طرح محکمات سے صرف نظر کر کے تشاہدات کی تاویل کرنا، محکمات کو ام الکتاب ماننے سے انکار کرنا ہے، اور فتنہ پروری ہے، اسی طرح حدیث کو قرآن پاک پر قاضی مانا، قرآن پاک کو 'حدیث اصدق' ماننے سے انکار کرنا ہے، اور فتنہ پردازی ہے۔ 'حدیث اصدق' کو حدیث کے تابع کرنا ویسے ہی فتنہ چاہنا ہے، جیسے محکمات کو تباہیات کے تابع کرنا۔ یہ مانا کہ حدیث قرآن پاک کی کسی آیت کی ناسخ ہو سکتی ہے، قرآن پاک کی حتمیت اور دوام سے انکار کرنا، اور حضور پاک ﷺ کیلئے، قرآن پاک سے مختلف اور احسن، ذاتی علم کا اثبات کرنا ہے، جبکہ قرآن حضور ﷺ کی زبان اقدس سے آپ کا تعارف اس طرح کرواتا ہے، **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى** ﴿٤﴾ **إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى** ﴿٦﴾ آپ تو پی خواہش نفس سے کوئی بات ہی نہیں کرتے۔ وہی کہتے ہیں جو آپ پر وحی ہوتا ہے۔ (سورہ الحجم ۳:۵۳-۴) یعنی قرآن پاک سے الگ اور احسن میرا توکوئی ذاتی علم ہے ہی نہیں۔ میری کوئی اپنی بات ہے ہی نہیں۔ مجھے تو حکم ہے کہ میں اللہ کے نازل فرمائے ہوئے کے مطابق حکم کروں۔ میری بات، اللہ ہی کی بات ہوتی ہے۔ کیا حدیث پاک اللہ کے حکم سے احسن کلام ہے جو اللہ کے حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔ قرآن پاک تو فرماتا ہے:- **وَمَنْ أَحْسَنْ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا** ﴿٢﴾۔ اللہ سے احسن حکم کس کا ہے! (کسی کا نہیں)۔ (سورہ المائدہ ۵:۵۰) اللہ تعالیٰ تو ارشاد فرماتا ہے:- **وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ**۔ ان میں اللہ کے نازل فرمائے ہوئے کے مطابق حکم کریں۔ (سورہ المائدہ ۵:۴۹) اور، **إِنْ أَنْتَ بِعَلَىٰ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ** ﴿٦﴾۔ فرمادیجئے میں کوئی نیار رسول نہیں ہوں۔ میں تو اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی آتی ہے۔ (سورہ الاحقاف ۶:۴۹) یعنی میرا ہر قول اور عمل اس وحی کے اتباع میں ہوتا ہے، جو مجھ پر آتی ہے۔ حدیث پاک تو اللہ کے کلام کی تاویل، تفصیل، توضیح اور تنقید ہی ہو سکتی ہے۔ حدیث کا اللہ کے کلام سے متناقض ہونا، اللہ کے کلام پر قاضی ہونا ممکن ہی نہیں۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے: **وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ جَهَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا** **فَيُوحِي** **بِإِذْنِهِ** **مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلَيْهِ حَكِيمٌ** ﴿١﴾ اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ اس سے کلام فرمائے، مگر وحی کے ذریعے سے، یا حجاب کے پیچے سے۔ یا کوئی رسول بھیج جو اس کے اذن سے وحی کرے، جو وہ چاہے۔ بے شک وہ بڑی شان والا، بڑی حکمت والا ہے۔ (سورہ الشوریٰ ۵۱:۴۲) اللہ کی عطاکی پہلی صورت وحی ہے۔ یہ بلا واسطہ ہوتی ہے۔ اس میں سنتے والے کو بتایا جاتا ہے کہ وہ کیا کرے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ کے قلب پر بربط رکھا اور رہنمائی فرمائی۔ اللہ کے بشر سے کلام کی دوسری صورت حجاب کے پیچے سے ہے۔ اس میں بندہ آواز کو سنتا ہے، اور امر الہی کی تعمیل کرتا ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا۔ بشر سے اللہ کے کلام کی تیسری صورت وحی کی وہ صورت ہے جو بذریعہ فرشتہ ہو۔ اس صورت میں مقام نزول قلب ہوتا ہے۔ وقت نزول قلب کھلتا ہے، عبارت نازل ہوتی ہے، اور بندے کی سوچ کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ (ماخوذ از تفسیر فاضلی منزل ششم) قرآن پاک حضرت جبرائیل علیہ السلام نے، اللہ کے امر سے، آپ ﷺ کے قلب اطہر پر اللہ کے فرمان کے مطابق بتدریج نازل فرمایا جو تقریباً تیس سال میں مکمل ہوا۔ اللہ کس کو اپنے کلام سے نوازتا ہے، اور کیسے نوازتا ہے، یہ فیصلہ قطعاً اللہ کا ہی ہوتا ہے۔ دائرة عبیدت میں کسی بھی اعتبار سے، آپ جیسی شان کسی اور کی نہیں۔ دیگر دو طریقوں میں سے کسی میں رب العالمین نے رحمت اللعلیین ﷺ سے کلام فرمانا پسند فرمایا، یا کسی اور طریقہ سے علم عطا فرمانا پسند فرمایا، علم عطا فرمانے والا جانتا ہے یا جسے علم سے نوازا گیا وہ جانتا ہے۔ آپ ﷺ کو عطا فرمائے گئے کسی علم کے قرآن پاک سے متناقض ہونے کا تصور قطعاً خلاف ہوتا ہے۔

اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم نے قرآن پاک کو علم والوں کیلئے مفصل فرمایا ہے۔ (سورہ الاعراف، 7:32) حضور پاک ﷺ سے زیادہ بڑے علم والا، قرآن پاک کے علم، حکمت اور تفصیل کو آپ سے بہتر سمجھنے والا، سمجھانے والا، بیان کرنے والا کوئی ہو نہیں سکتا۔ حضور نے جو بھی فرمایا، فرمان الٰہی کے علم، حکمت اور تفصیل ہی کو کھولا ہے۔ حدیث پاک کے قرآن پاک کی کسی آیت کے ناتخ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک احکام شریعت کا تعلق ہے، قرآن پاک حکم ہے اور دائی گئی ہے۔ حدیث پاک تنفیذ حکم ہے۔ حتیٰ اور دائی گئی احکام کی تنفیذ کا طریقہ دائی گئی نہیں ہو سکتا۔ تنفیذ حکم کے طریقے کا وقت، مقام، مقدار اور استطاعت کی مناسبت سے تشکیل پانا لازم ہے۔ حدیث پاک، دائی گئی حکم الٰہی کی تنفیذ کی نظیر (precedent) ہوتی ہے۔ قرآن پاک قول ہے، حدیث پاک عمل ہے، اور فقه علم ہے۔ قرآن پاک کو حکم مانا جائے، حدیث پاک کو تنفیذ حکم کی نظر مانا جائے، تو فقه پروان چڑھتا ہے۔ قرآن اور حدیث کے متون کو "نص" کی غیر قرآنی، خلاف شرع، خلاف سنت اصطلاح، دین میں داخل کر کے، دونوں کو مانند شریعت تھہرانے کی وجہ سے فقہ پر صدیوں سے جود طاری ہے۔ حضور ﷺ سے منسوب روایات میں سے ایک قسم احوال آخرت (eschatological events) مقصود تخلیق کائنات، فضائل اعمال، یا مرتضیم ہستیوں کے بارے میں تمثیل وغیرہ سے متعلق بیان ہیں جو مسلم معاشرے میں راجح ہیں۔ ان سے حوالے دئے جاتے ہیں۔ اہم مذہبی فرقہ وارانہ عقائد اختراع کے جاتے ہیں اور معاملات کی توضیح کی جاتی ہے۔ کائنات کے مقصد اور انسانی فطرت، بعض ہستیوں اور بعض اعمال واذکار کے فضائل کے بیان میں انہیں سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسرائیلی روایات بھی ان میں شامل ہو گئی ہیں، اور بعض جید سمجھے جانے والے علماء بھی نادانستہ طور پر انہیں قابل ذکر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ فرقہ وارانہ عقائد و نظریات پر مشتمل بہت ساری روایات اسی نوعیت کی ہیں۔ کسی کے مرشد کا ارشاد، کشف و شہود یارو یا کی تعبیر، عقیدہ تمدن کیلئے ضرور قابل احترام ہوتی ہے، لیکن وہ تحقیق حق کے طور پر بیان کئے جانے کے قابل (quote) اسی صورت ہو سکتی ہے، جب قرآن پاک کی سند کے ساتھ پیش کیا جانا ممکن ہو۔ قرآن پاک کی آیات تباہات کی تاویل کو آیات حکمات کی بنیاد پر استوار کرنے کے بارے میں سورہ آل عمران 3:7 کا حکم، اور حدیث کے "حدیث اصدق" کے مطابق ہونا، اس قسم کی احادیث، روایات، متكلّمین کے نظریات، صوفی مرشدوں کے مشاہدات کی تاویل، اقوال اور ارشادات پر بھی بالکل اسی طور عائد ہوتا ہے۔ حکمات کو نظر انداز کر کے احادیث، روایات، صوفیانہ مشاہدات، ارشادات کی من مانی تشریح کی جائے، عقیدہ سازی اور نکتہ آفرینی کیجائے، تو ایسے شخص کے قلب میں بھی ہے، اور وہ فتنہ پرور ہے۔

(ل) توحید اور رسالت

بعض لوگ توحید کی تفسیر کرتے ہوئے، اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے میں تفریق کرتے ہیں۔ اللہ اور اسکے رسولوں میں تفریق نہ کرنا، ایمان کی

لازمی شرط ہے۔ اللہ کے آخری نبی ﷺ پر ایمان لا کرہی تمام رسولوں اور اللہ پر ایمان لانا ممکن ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكُفِّرُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفْرَقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ
وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا ﴿١٥١﴾ أَوْ لَا إِنْكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا وَأَعْنَدُنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا

القرآن (النساء: 151، 150)

"وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اسکے رسول کے ما بین تفریق کریں، ۔۔۔ بھی حقیقی کافر ہیں ۔۔۔"

اس بات کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے کہ اللہ کے رسول، اللہ کے دوست، اللہ کے محبوب بندے اللہ کے مقابل والے / اللہ کے سوا (من دون اللہ) نہیں ہوتے، اور اللہ کے مقابل والے اللہ کے دوست نہیں ہوتے۔ اللہ کے رسول ﷺ اور آپ کے دوستوں کو مساوی میں شامل کرنا خلاف حق ہے۔ اللہ تعالیٰ محسین سے محبت کرتا ہے۔ (البقرہ 2:195) اللہ تعالیٰ تو ایں سے محبت رکھتا ہے۔ (البقرہ 2:222) اللہ تعالیٰ مظہرین کی حب رکھتا ہے۔ (البقرہ 2:222) اللہ تعالیٰ مُتّقین کی حب رکھتا ہے۔ (آل عمران 3:76) اللہ تعالیٰ صابرین کی حب رکھتا ہے۔ (آل عمران 3:146) اللہ تعالیٰ متوکّلین کی حب رکھتا ہے۔ (آل عمران 3:159) اللہ تعالیٰ مظہرین سے محبت رکھتا ہے۔ (توبہ 9:108) اللہ تعالیٰ مُقتضین سے محبت رکھتا ہے۔ (المتحف 8:60) اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے، جو اسکی راہ میں صفتہ ہو کر رہتے ہیں جیسے سیسے پلائی ہوئی دیوار ہوں۔ (الصف 4:61) جو حضور ﷺ کا اتباع کرتے ہیں، اللہ ان سے محبت کرتا ہے۔ (آل عمران 3:31) یہ سب اللہ کے محبوب بندے ہیں۔

جو لوگ برائیوں کو اختیار کر لیتے ہیں، قرآن پاک میں ان کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا گیا ہے :

اللہ ظالیمین کی حب نہیں رکھتا۔ (آل عمران 3:140) اللہ مفسدین کی حب نہیں رکھتا۔ (المائدہ 5:64) اللہ مسرفین کو پسند نہیں کرتا۔ (الانعام 6:141) اللہ حد سے بڑھنے والوں (معذین) کو پسند نہیں کرتا۔ (الاعراف 7:55) اللہ خائنین کو پسند نہیں کرتا۔ (الانفال 8:58) اللہ مستکبرین کو پسند نہیں کرتا۔ (المومنون 23:16) اللہ کسی ناشکرے گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔ (البقرہ 2:276) اللہ کافرین کو پسند نہیں کرتا۔ (الرعد 30:45، آل عمران 3:45)

اللہ اترانے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ (الحدید 57:23، لقمان 31:18، النساء 4:76) اللہ غاباز گناہ گار کو پسند نہیں کرتا۔ (النساء 4:107)

اللہ غاباز، ناٹکرے کو پسند نہیں کرتا۔ (الجعجع 38:22) اللہ فار حین کو پسند نہیں کرتا۔ (القصص 28:76) ان بری صفات کے حامل، اللہ کے محبوب بندے نہیں ہیں۔

برائی سے کراہت، اللہ کو پسند ہے۔ برے سے کراہت، اللہ کو پسند نہیں ہے۔

جو اللہ کے محبوب بندوں میں سے کسی کی صفت اپنالیتا ہے، اسکے قریب ہو جاتا ہے، وہ اللہ کو محبوب ہو جاتا ہے۔ اللہ کے محبوب کی صفات، محبت کے ساتھ اتباع کرنے سے ہی آتی ہیں۔ ہر بُنیٰ اور رسول اپنی قوم کیلئے اللہ کی عبیدیت کا معیارِ مطلق تھا۔ ہر بُنیٰ اور رسول نے قوم سے اپنی اطاعت اور اتباع کا مطالبہ کیا۔ ارشاد باری ہے :

”فَمَا دِبَّجَنَّ، أَكْرَمَ اللَّهَ كَيْ حَبَّ رَكَّحَتْهُ هُوَ تَوْمِيرُ الْإِتَّابَعَ كَرَوْ؛ اللَّهُ تَعَالَى يَعْصِيْ حَسِيبَ بَنَالَهُ، اُوْرَ تَمَّهَارَے گَنَاهَ بَجَشَ دَے گَا۔ اللَّهُ تَعَالَى يَعْصِيْ وَالَّرَّحْمَ فَرَمَانَهُ وَالَّا ہے۔“ (آل عمران 31:31) یعنی جو اللہ کے محبوب کو محبوب بنا لیتا ہے، وہ اللہ کو محبوب ہو جاتا ہے، اللہ اس کو اپنا حسیب بنالیتا ہے۔ ارشاد باری ہے :

”جَوَ اللَّهُ تَعَالَى اُوْرَ اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کرے، تو اسے ان لوگوں کی معیت حاصل ہو گی۔ جن پر اللہ تَعَالَى کا انعام ہوا، کہ وہ نبیین اور صدِّیقین اور شہداء اور صالحین ہیں۔ یہ کیسے اچھے رفق ہیں۔“ (سورہ النساء 4:69)

نبی اے کریم ﷺ تمام بُنیٰ آدم کیلئے اللہ کی عبیدیت کا معیارِ مطلق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ”عبدہ“ اور ”عبدہ“ کہہ کر اپنے محبوب کے عبیدیت کا معیارِ مطلق ہونے کی تصدیق فرمائی ہے۔ (الاسراء 1:17، الفرقان 1:25) اللہ کے محبوب بندوں کی صفات جس اکمل درجے میں حضور نبی اے کریم ﷺ میں پائی جاتی ہیں، وہ کسی اور میں نہیں پائی جا سکتیں۔ اپنے محبوب پاک کو یہ صفات خود اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائی ہیں۔ حضور نبی پاک ﷺ، اللہ کے محبوب ترین بندے اور روشن چراغ ہیں۔ اس چراغ سے جو روشن ہوئے وہ بھی اللہ کے محبوب بندے ہیں اور روشن چراغ ہیں۔

جو لوگ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَاتِرْجِهِ "اللہ کے سوا" / "اللہ کے مقابل والے" کرتے ہیں اور اللہ کے دوستوں، محبوب بندوں، النبیین، صدِّیقین، شاہدین اور صالحین کو بھی اس میں لپیٹ لیتے ہیں، اللہ ان کی لا علمی کو معاف کرے، وہ درست ترجمہ نہیں کرتے۔ رب العالمین نے اپنے محبوب ترین دوست ﷺ کو تمام بُنیٰ نوع انسان کیلئے اپنی رحمت کی تقسیم کا شرف بخشاہے۔ کیا وہ (معاذ اللہ) مِنْ دُونِ اللَّهِ ہیں! اللہ کے دوست اللہ کی معیت میں ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی پاک جماعت ہوتے ہیں۔ (فرشتہ بھی اللہ کی پاک جماعت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کئی مقامات پر فرشتوں کے عمل کو اپنے ساتھ منسوب کیا ہے۔) کیا اللہ نے اپنے محبوب ترین دوست کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ نہیں قرار دیا۔ (سورہ الفتح 48:10) کیا اللہ تعالیٰ نے آپکے عمل کو اپنے ساتھ منسوب نہیں کیا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے قدم کو اپنے سے قدم قرار نہیں دیا۔ اللہ کے محبوب بندے اللہ کے مقابل والے تھے۔ مرتبے تقسیم کرنے کیلئے ہوتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جنہیں تزکیہ عطا کرنے، کتاب کا علم اور حکمت عطا کرنے، رحمت تقسیم کرنے کا مرتبہ عطا فرمایا، کیا وہ اللہ کے مقابل والے، یا اللہ کے مساوے ہو سکتے ہیں۔

4. فرد، جماعت، قوم اور اقوام عالم کے لئے ہدایت کا محااظر کھانا۔

ارشاد باری ہے:- إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ﴿١﴾ یہ تو ہے مگر عالمین کیلئے نصیحت۔ (سورہ الانعام 6:90) وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ ﴿٢﴾ اور بے شک ہم نے آپ ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ (الانبیاء 21:107) تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيُكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ﴿٣﴾ بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل فرمایا، کہ وہ عالمین کے لئے ڈر سنانے والا ہے۔ (الفرقان 25:1) تفسیر قرآن کی روایت میں بہت کم ہی اس بات کا ادراک کیا گیا کہ فرد، جماعت، اجتماعیت (قوم اور اقوام عالم) کے حوالے سے ہر فرمان الٰہی کے تقاضوں کو الگ الگ طور پر روشن کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم معاشروں میں معاشرتی، قوی اور میں الاقوای شور اجاگر ہی نہیں ہو سکا۔ جس حکم الٰہی کا مخاطب قوم یاریاست ہوتی ہے، فرد اسے اپنے پر محول کر کے قانون کو ہاتھ میں لے لیتا ہے اور امر بالمعروف اور نهى عن المنکر کے نام پر فتنہ پیدا کرنے کا باعث ہتا ہے، اور بھول جاتا ہے کہ شرک، کفر اور بغاوت سے بڑا جرم ترققہ ہے۔ جہاں حکم الٰہی کا مخاطب فرد ہوتا ہے، وہاں جماعت اور ریاست دین کے نام پر اپنی ریٹ مسلط کرنے پر تل جاتی ہے۔ قرآنی تعلیم سے حاصل ہونے والا سماجی شور یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ رہا جائے اور جماعت کو ساتھ رکھا جائے۔ چھوٹی جماعت، اپنے آپ کو بڑی جماعت کے پیچھے رکھ۔ فرد یا جماعت دین کے نام پر اپنا نظر یہ دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرے۔ انفرادی طور پر بھی

بھلائی کی جائے، جماعت کو بھی مضبوط بنایا جائے۔ منکرات کے معاملے میں قانون کو ہاتھ میں نہ لیا جائے، اور ریاست کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔ تمام انسانوں کے کیساں انسانی حقوق، جان مال عزت آبرو کی حفاظت، قانون کی نظر میں برابری، "لَا اکرہ فی الدین" کے فرمان کی روشنی میں تمام اقوام عالم کے اپنے عقیدہ و مذہب کے مطابق کیساں آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کے حق کا شور قرآن پاک نے ہی دیا ہے، جو ہی نوع انسان کو خوف اور حزن سے آزاد کرنے، اور امن عالم کے لئے ضروری ہے تاکہ دنیا اسلام کی برکات سے بہرہ در ہو سکے۔

5. آیات قرآن پاک کے دوام کو ماننا حق ہے، محدود کرنے کی کوشش حق نہیں ہے۔

جس ترجمہ و تفسیر میں ایسا اسلوب تفسیر اختیار کیا جائے گا جو قرآن پاک کے پیغام اور تنفیذ احکام کو کسی ایک وقت، مقام یا مقدار کے اندر محدود کرے، اور اس کے دوام کے منافی ہو، وہ درست نہیں ہو گا۔ جیسا کہ اوپر بیان کی گیا ہے، إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ﴿٢٧﴾ یہ تو ہے گر عالمین کیلئے نصیحت۔ (سورہ الانعام: 90، مزید حوالوں کیلئے دیکھئے سورہ القلم 68:52، سورہ الشکور 81:27) قرآن پاک تمام زمانوں اور تمام انسانوں کیلئے نصیحت، ہدایت اور رہنمائی ہے۔ اس لئے آفاقی، حقی اور دائیٰ ہے۔ شان نزوں کے حوالے سے تفسیر قرآن کا جو اسلوب راجح ہے وہ قرآن پاک کے پیغام کی تحدید کرتا ہے، اور آفاقیت، حقیقت اور دوام کے منافی ہے۔ حدیث پاک کو مأخذ شریعت قرار دینے کا بھی بھی نتیجہ نکلتا ہے۔

جس کلام کا اپنادرج خود کلام الٰہی کی تاویل، تعبیر، توضیح اور تنفیذ کا ہو
جو حقی ہو لیکن دائیٰ نہ ہو

جس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے نہ لیا ہو

جس کا شک و شبہ سے پاک ہونا لازم نہ ہو

جس کا تضاد سے پاک ہونا محل نظر ہو

اس کلام کو حقی اور دائیٰ معیار حق کی تاویل کیلئے حکم (اتھارٹی) بنالیما صولاً درست نہیں ہو سکتا۔

6. 'اخیر' اور 'غیر' کے درمیان وقف لازم ہے۔ بنی اسرائیل کی روایات کے حوالے سے تفسیر پیان کرنا وقف لازم کا عدم لحاظ ہے۔

آیت پاک کے دو ایسے حصوں کے درمیان، جن میں سے ایک میں اہل حق کی، اور دوسرے حصے میں اہل باطل کی بات بیان کی گئی ہو، تلاوت قرآن کے درمیان وقف لازم کو ملحوظ رکھنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔ یہ قول کی صورت میں وقف لازم ہے۔ وقف لازم عمل میں بھی ہوتا ہے۔ سورہ المحتنہ میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اے ایمان والو! جب تمھارے پاس ایمان والی مہاجر عورتیں آئیں، تو ان کا امتحان کرو۔ اللہ کو ان کے ایمان کا بڑا علم ہے۔ پھر اگر

تمھیں وہ ایمان والی معلوم ہوں، تو انہیں کافروں کی طرف نہ لوٹا کرنے یہ عورتیں انھیں حلال ہیں اور نہ وہ مرد انھیں حلال ہیں۔۔۔"

(المحتنہ 60:10) یعنی کافر عورتوں اور مردوں اور ایمان والی عورتوں اور مردوں کے درمیان وقف لازم ہے۔ اگر یہ فرق ثابت ہو

جائے تو ان کے درمیان وقف لازم کو ملحوظ رکھنے کا حکم ہے۔

اسی طرح جب کسی مقام پر اللہ کی رضا اور اپنی خواہش کا تقاضا ایک ہو جائے، وہاں ساکن ہو جانا، اپنی خواہش اور اللہ کی رضا کے درمیان وقف رکھنا، متین کی طریقہ ہے۔ یہ عمل میں وقف لازم کا دھیان رکھنے کا طریقہ ہے۔

تفسیر قرآن میں وقف لازم کو ملحوظ رکھنے کا تصور کہیں دیکھا نہیں گیا حالانکہ یہ بھی ویسا ہی ضروری ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ "اہل کتاب کی الہامی کتابیں تحریف شدہ ہیں۔" (الناء 4:46، البقرہ 75:46) جس کلام کے تحریف شدہ ہونے کی سند اللہ تعالیٰ نازل فرمرا ہے، کیا اسے سند کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے؟ کیا اس آیت پاک سے یہ اصول تفسیر اخذ نہیں ہوتا کہ اسرائیلی روایات کے حوالے سے قرآن پاک کی تفسیر بیان کرنا، تفسیر میں وقف لازم کا عدم لحاظ ہے؟ سورہ العنكبوت کی آیت مبارکہ:

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالِّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا بِالِّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ
وَإِلَهُنَا وَإِلَهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿٤٦﴾ "اور اہل کتاب سے مجادله کرو مگر بطریق احسن، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ان میں سے ظلم کیا، اور کہو کہ ہم اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل ہوا اور جو تمھاری طرف نازل ہوا، اور ہمارا اور تمھارا اللہ ایک ہی ہے، اور ہم اسی کو مانتے ہیں۔" (سورہ العنكبوت 29:46)

کے ذریعے مسلمانوں کو اہل کتاب سے مکالہ کا اصول یہ دیا گیا ہے کہ "اگر وہ اپنی الہامی کتابوں کے حوالے سے کوئی بات کریں اور وہ قرآن پاک سے صریحاً متناقض نہ ہو، تو مجھی انکی کسی بات کی تصدیق سے احتراز کرنا ویسے ہی ضروری ہے جیسے کہ انکی بات کی تردید سے۔ یہ کہنے کا حکم ہے کہ: "ہم ایمان لائے اس پر جو ہماری طرف نازل ہوا، اور جو تمہاری طرف نازل ہوا، اور ہمارا اور تمہارا اللہ ایک ہی ہے، اور ہم اسی کو مانتے ہیں۔"

حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کی روایات قرآن پاک سے صریحاً متناقض ہیں۔ قرآن پاک میں ان کی تصدیق کا قطعاً کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ اس کے باوجود اکثر مکاتیب فکر کے جدید علماء اسرائیلی صدیوں سے ان روایات کو تفسیر قرآن کی بنیاد بنا رہے ہیں، جو کہ تفسیر قرآن کے قرآنی اصولوں کے صریحاً منافی ہے اور تفسیر قرآن میں وقف لازم کے عدم لفاظ کا ارتکاب ہے۔

7. قرآن پاک "الحق" ہے، اور اللہ "الحق" کا نازل فرمانے والا۔

"قرآن پاک اللہ کا نازل کردہ کلام ہے اور "الحق" کا درج رکھتا ہے" اور "اللہ تعالیٰ الحق کا نازل فرمانے والا ہے۔" دونوں ایک دوسرے کا عین نہیں ہو سکتے۔ جو ترجمہ، تفسیر یا مطالعہ قرآن دونوں کو ایک قرار دیتا ہے، وہ درست نتائج اخذ نہیں کر سکتا۔ اس سے صرف فکری الجھاؤ ہی جنم لے سکتے ہیں جو یونچ واضح کئے گئے ہیں۔ "الحق" کا لفظ قرآن پاک میں اپنے مختلف مشتقات کی صورت میں 227 مقالات پر آیا ہے۔ ان میں سے 224 مقالات پر "الحق" سے اللہ تعالیٰ مراد لئے جانے کا کوئی قرینہ نہیں۔ بہت سارے مقالات پر صریحاً فرمایا گیا ہے کہ "ہمارا نازل کیا گیا کلام "الحق" ہے۔" یا "اس الحق کی تزییں تمہارے رب کی طرف سے ہے۔" صرف تین مقامات میں جہاں لوگوں نے "الحق" سے مراد اللہ لیا ہے۔

"الحق" کو اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنی میں سے سمجھتے کا عقیدہ، قرآن پاک کی سند کے مطابق درست نہیں ہے۔ قرآن پاک میں لفظ "الحق" "اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ کلام" کیلئے آیا ہے۔ قرآن پاک کی اپنی سند کے مطابق، ماضی میں نازل کردہ کلام اللہ میں تحریف کی جا چکی ہے۔ اسلئے "الحق" ہونے کا درجہ حال پر صرف اور صرف قرآن پاک ہی کو حاصل ہے۔ کئی مقامات پر بہت ہی واضح لفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ جو محمد الرسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا گیا، وہی الحق ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔" مثلاً

... بِمَا نَزَّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ۔ ﴿١﴾ "محمد ﷺ پر جہاں نازل فرمایا گیا ہے، وہی ان کے رب کی طرف سے "الحق" ہے۔

(معیار حق) ہے۔" (سورہ محمد 47:02)

... لَقَدْ جَاءَكُمْ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ۔ ﴿٢﴾ بے شک تمہارے پاس "الحق" آیا ہے تمہارے رب کی طرف سے۔" (سورہ یونس 10:94)

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَبِّ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٣﴾ أَمْ يَقُولُونَ إِفْتَرَاهُ جَنْهُ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ۔ ﴿٤﴾ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کتاب کی تزییں رب العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ آپ کا افتراء ہے۔ بلکہ وہ "الحق" ہے آپ کے رب کی طرف سے۔ (سورہ العجده 32:3-2)

... وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ۔ ﴿٥﴾ اللہ جو فرماتا ہے وہ "الحق" ہے۔ (سورہ الاحزاب 33:04)

وہ مقامات جہاں "الحق" کی تعبیر میں مفسرین کو مغالط لگا ہے، درج ذیل ہیں:

یوم حشر جب تمام خلق کو حساب کیلئے کھڑا کیا جائے گا، تو ہر نفس کو پتہ چل جائے گا کہ اس نے کیا کیا تھا، اور فلاح حاصل کرنے کیلئے اسے کیا کرنا چاہئے تھا۔ "وَرُدُوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقُّ۔ ﴿٦﴾" (پھر انہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں، جو ان کا حقیقی مولا ہے، حساب اور جزا کیلئے پیش ہونا پڑے گا۔) اس دن کمذہ میں حق سے وہ تمام افتراء جو وہ باندھا کرتے تھے، جاتے رہیں گے۔ (ماخوذ، سورہ الانعام 6:62، اور یونس 10:30)

سورہ نور میں ارشاد ہے: يَوْمَئِذٍ يُوْفِيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقُّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ﴿٧﴾ "اس دن اللہ انکو پورا بدلہ دے گا جس کے وہ مستحق ہیں، اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ "اللہ ہی سچاروشن کرنے والا ہے۔" (سورہ التور 24:25)، اور

سورہ الحجج میں ارشاد ہے: ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحِبُّ الْمُؤْمِنَى وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٨﴾ "یہ اس لئے کہ "اللہ ہی پروردگار حقیقی" ہے، وہی مرضیوں کو زندہ کرتا ہے اور وہی ہر شے پر قادر ہے۔" (سورہ الحجج 6:22)

"الحق" سے اللہ مراد لئے جانے کی گنجائش ان تینوں مقالات پر بھی نہیں ہے کیونکہ اس سے آیت پاک کا مفہوم درست نہیں رہتا اور دیگر 224 مقالات کے ساتھ تضاد واقع ہو جاتا ہے۔ اگر اس یقین کے ساتھ قرآن پاک میں تدبیر کیا جائے کہ یہ تضاد سے پاک کلام ہے، تو پھر ان مقالات پر بھی "الحق" سے مراد اللہ نہیں لیا جائے گا۔

کیا سورہ محمد کے اس ارشاد کے بعد "۔ بِمَا نَزَّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ۔ ﴿٢﴾" "محمد ﷺ پر جو نازل فرمایا گیا ہے، وہی ان کے رب کی طرف سے 'الحق' ہے۔ (سورہ محمد 47:02)" اللہ تعالیٰ کو 'الحق' کہنے یا 'الحق' کو اللہ تعالیٰ کے اسماء الحقی میں شامل سمجھنے کی کوئی ذرہ سی بھی گنجائش رہ جاتی ہے؟

پورے چودہ سوال کے تفسیری لٹریچر میں سوائے تفسیر فاضلی (طبع شدہ 1997-1981) کے ہماری نظر میں کوئی اور ترجمہ و تفسیر ایسا نہیں جس میں اس فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ 'الحق' کو اللہ کا نام قرار دیکر اللہ اور کلام اللہ، دونوں کو 'الحق' کہنے سے مسلم فکر کی تاریخ میں جو فکری مسائل پیدا ہوئے ان میں سے چند 'ناخ- منسون'، 'خلق قرآن'، 'اجر و تدری رضا اور مشیت میں فرق' اور 'وحدة الوجود' کے نام سے مشہور ہیں۔^۱

8. قرآن پاک کی کوئی آیت منسون نہیں ہے۔

تفسیر قرآن کے قرآنی اصولوں کا درست اور اک نہ ہونے یا انہیں ملحوظ رکھنے میں کوتاہی کے نتیجہ میں فہم قرآن میں تضادات کا جنم لینا لازم تھا۔ ان میں سے ایک مقام جہاں علماء کرام "قرآن پاک" کو تضاد سے پاک کلام "مانے پر پورے نہیں رہ سکے، سورہ المقرہ کی آیت نمبر 106 بھی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ

مَا نَسَخَ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِيَّا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا أَلَمْ تَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٦﴾" جب ہم کوئی آیت منسون فرمائیں یا بجلادیں، تو اس کی مثل یا اس سے بہتر لے آتے ہیں۔ کیا تمھیں علم نہیں کہ اللہ ہر شی پر قادر ہے۔" (ابقرہ 2:)

(106)

جو کلام پاک بتدریج نازل ہو رہا ہو، کتنی عسیر الفہم بات ہے کہ جب کوئی حکم نازل ہو گا تو اسے اس وقت تک نازل شدہ متن کلام کے تناظر میں دیکھا جائے گا۔ نزول وی مکمل ہونے پر اس حکم کو پورے کلام اللہ کے تناظر میں دیکھا جائے گا۔ قرآن پاک نے خود اس کیلئے "مفصل کرنا" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ قرآن پاک کے ایک مقام کا بیان دوسرے مقام پر مفصل ہوتا ہے۔ ارشاد باری ہے: **إِلَفَ-لَام-رَاءُ طِكَابُ الْحَكْمَةِ أَيَّاثُهُ وَنُمُّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَيْرٍ ﴿١١٦﴾** "الرا ف" یہ کتاب ہے، جس کی آیات حکمت والی ہیں۔ پھر انہیں حکمت والے، خبر والے کی طرف سے مفصل فرمایا گیا ہے۔" (سورہ هود 11:16)

یہ بھی ارشاد ہے:

اس کتاب کو علم والوں کیلئے مفصل فرمایا گیا ہے۔ (سورہ الاعراف: 32)

اس کتاب کو علم سے مفصل فرمایا گیا ہے۔ (سورہ الاعراف: 52)

نصیحت ماننے والوں کیلئے اس میں ہر شی کی تفصیل ہے۔ (سورہ الانعام: 127)

اس میں ہر شے کی تفصیل کھول کر بیان کر دی گئی ہے۔ (سُوْكُلَّ شَيْءٍ فَصَلَّنَا وَ تَفْصِيلًا ﴿١٢﴾ سورہ الاسراء 12:12)

تمام آیات قرآنیہ (محکمات اور تختابہات) 'حکمت' والی آیات ہیں۔ آیات کا باہمی تعلق حکیم خیر کی طرف سے یہ رکھا گیا ہے کہ ایک مقام کا بیان دوسرے مقام پر مفصل ہوتا ہے۔ اسکی کوئی آیت کسی بھی اعتبار سے کمزور، ظنی، اعتباری یا منسون نہیں ہے۔ سارے کاسارا قرآن پاک حتمی اور داہمی ہے اور مطلق طور پر تضاد سے پاک ہے۔ جو مفسرین کرام تفسیر قرآن کے قرآنی اصولوں کا کماحہ اور اک نہیں رکھتے، بعض مقامات کے باہمی تعلق کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور تضاد فکر کا شکار ہو جاتے ہیں، اس کا حل وہ آیات قرآن پاک کے 'ناخ- منسون' میں تقسیم کی صورت میں تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح بہت سی بھی فکری ایجادیں جنم لیتی ہیں۔

جس کلام کو اللہ نے حق کے تعین کا معیار، سند، اتھاری، فرقان اور میزان بنانے کا بھیجا اس کی کسی آیت پاک کو منسون قرار دینا دراصل اس کے معیار حق ہونے، حق اور ناحق میں فرق کے اعتبار سے فرقان اور میزان ہونے پر شکوہ و شہہات اٹھانے والی بات ہے۔ ہم آہم آیات کا، جن پر ناخ- منسون کا لیبل لگایا جاتا ہے، اپنی کتاب میں جائزہ لینے کے بعد پورے وثوق سے کہہ رہے ہیں کہ قرآن پاک کی کوئی آیت منسون نہیں ہے۔ خود ساختہ، اختزاعی نظریات کو سند مہیا کرنے کیلئے روایات گھڑی جاتی ہیں، جو آگے چل کر لفڑس کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔

سورہ البقرہ (2) کی آیت نمبر 106 اور سورہ النحل (16) کی آیت نمبر 101 "اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلتے ہیں، اور اللہ کو سب سے بڑا علم ہے جو وہ نازل فرماتا ہے، کہتے ہیں تم تو بنالاتے ہو۔ بلکہ وہ اکثر لا علم ہیں۔" کا تعلق سابقہ شریعتوں سے ہے۔ سابقہ شریعتوں کی نویعت و قتل تھی۔ ماضی میں نازل شدہ اکلام اللہ کے احکام مجموعی طور پر عالمین کیلئے نہیں تھے۔ ان سابقہ شریعتوں میں بعض وقتی احکام پر مشتمل آیات کو قرآن پاک میں دائیٰ احکام پر مشتمل آیات سے بدل دیا گیا۔ دائیٰ احکام پر مشتمل آیات منسوخ نہیں ہو سکتیں۔ قرآن پاک کے ایک مقام کا بیان دوسرے مقام پر مفصل ہوتا ہے۔

"نئے کے مستعمل، راجح اور معروف معنی فتح کرنا، کا لعدم قرار دینا، تنتیح کرنا، کنسیل کرنا ہی ہیں۔ اس کے انگریزی مترادف abrogation کے بھی بھی معانی ہیں۔ سورہ البقرہ کی آیت نمبر 106 کے منشاء کا تعین کرنے کیلئے ضروری ہے کہ دیکھا جائے، یہ آیت کریمہ مثابہات میں سے ہے یا محکمات میں سے۔ اگر مثابہات میں سے ہے تو پھر محکمات کی بنیاد پر اس کے منشاء کا تعین کیا جائے۔

یہ آیت پاک کسی حکم پر مشتمل نہیں، محض ایک بیان ہے۔ اسلئے مثابہات میں سے ہے۔ جو آیت پاک، خود محکمات میں سے نہ ہو، اسے حکم (اتحاری) بناتے ہوئے محکمات پر اسکا اطلاق کرنا، کچھ کونٹخ اور کچھ کو منسوخ قرار دینا، سورہ آل عمران 3:7 کے منشاء کے صریحاً خلاف ہے کیونکہ محکمات تو ہیں ہی ام الکتاب۔ یہ کہا جائے کہ یہ آیت پاک محکمات میں سے ہے، تو بھی یہ درست نہیں ہو گا۔ حکم آیات، آپس میں تناقض نہیں ہو سکتیں، اسلئے کہ تمام حکم آیات "ام الکتاب" ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ قرآن پاک کی کسی آیت کو منسوخ ٹھہرانا خلاف حق ہے۔

9. فرد، جماعت، قوم اور میں الا قوامیت

قرآن پاک کے احکام کا تقاضا فرد کے حوالے سے اور ہے، جماعت کے حوالے سے اور؛ اور اجتماعیت کے حوالے سے اور ہے۔ قرآن پاک کی تفسیر کرتے ہوئے یہ دیکھنا کہ کسی فرمان الہی کا منشاء فرد کیلئے کیا ہے، جماعت کیلئے کیا ہے، اور اجتماعیت کیلئے کیا ہے اور اس فرق کو روشن کرنا نہایت ضروری ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

جس آیت پاک میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے، وہ فرد سے یہ تقاضا نہیں کرتا کہ وہ ایک پرائیویٹ آرمی بنائے اور جسے وہ مسلمانوں کا دشمن سمجھتا ہے، اس پر ہلہ بول دے۔ اعلان جہاد ہمیشہ ریاست کرے گی، اور جہاد ہمیشہ سربراہ ریاست کی سرکردگی میں کیا جائے گا۔

امر بالمعروف اور نهى عن المکر کے حوالے سے معاشرتی برائیوں سے روکنے کا حکم فرد یا کسی جماعت کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ بھلائی کے فروغ یا برائی سے تدارک کے نام پر قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی تجویز دوسروں پر مسلط کرے۔

اتحاد میں اللہ— ("وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ" کو روشن کرنا)

علم تفسیر کی تاریخ میں فرد، جماعت اور اجتماعیت (یعنی بنی نوع انسان) کے حوالے سے فرمان الہی کی ہدایت کو الگ الگ درجے کیلئے روشن کرنے کی مثالیں بہت ہی کم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بھی چوب زبان شخص، دین اسلام اور عشق رسول کے نام پر مسلمانوں کو بر امیختہ کر کے قانون کو اپنے ہاتھ میں لیکر سماجی فتنہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

سورہ الرعد میں اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل میں فرق، تمثیل کی صورت میں بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ حق بارش کے پاک پانی کی مانند ہے۔ آسمان سے بارش برستی ہے تو نالے بہہ لکتے ہیں۔ راستے کی کثافتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں جو جھاگ کی صورت اوپر آ جاتی ہیں۔ جھاگ زیادہ دیر اپنے کو قائم نہیں رکھ سکتا، سوکھ کر کناروں پر رہ جاتا ہے اور پاک پانی بہتار ہتا ہے۔ دوسری مثال دھاتوں کے پگھلانے جانے سے تعلق رکھتی ہے۔ جب آگ پر دھاتوں کو پگھلاتے ہیں، تو بھی کثافتیں جھاگ بن کر اوپر آتی ہیں، سوکھ کر الگ ہو جاتی ہیں اور خالص دھات باقی رہ جاتی ہے۔ اس مقام پر ارشاد باری ہے: -- وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فِيمَكُثُ فِي الْأَرْضِ ط" اور جو لوگوں کو نفع دیتا ہے، سوز میں میں باقی رہتا ہے۔" (سورہ الرعد 13:17) حق، تمام بنی نوع انسان کی میراث ہے۔ حق تمام بنی نوع انسان کے فائدے کا پہلو اپنے اندر لازماً رکھتا ہے۔ کسی آیت پاک کی تفسیر بیان کرتے ہوئے اس فرمان الہی میں وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ (تمام بنی نوع انسان کے فائدے) کے پہلو، اور مسلمانوں پر، بنی نوع انسان کے حوالے سے عائد ہونے والے حق کو روشن کرنا، نہایت ضروری ہے۔

10. اللہ اور اسکے رسول سے تقدم نہ کرنے کے حکم کو ملحوظ رکھنا۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقْدِمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۝ وَأَنْتُمُوا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلَيْمٌ ۝ اَءِيمَانًا وَاللَّهُ اَوْلَىٰ ۝
اس کے رسول ﷺ سے تقدم نہ کرو۔ (سورہ الحجرات 1:49)

اس حکم کا اطلاق ترجمہ و تفسیر قرآن پر بھی ہوتا ہے۔ اللہ کا قدم تعمیں سے پاک ہے۔ اللہ کے رسول سے قدم آگے بڑھنا ہی، اللہ سے قدم آگے بڑھانا ہے۔ بعض آیات حروف مقطعات پر مشتمل ہیں، اور بعض محض ان سے شروع ہوتی ہیں۔ حروف مقطعات کی تاویل حضور نبی کریم ﷺ سے بہتر کوئی اور بتا سکنے کا اہل نہیں ہو سکتا تھا۔ حضور نبی پاک نے اس مقام پر خاموش رہنا پسند فرمایا۔ حروف مقطعات پر مشتمل آیات کی تاویل آئیں پر کئی صفحے بھی تحریر کر دیئے جائیں، تو آخر میں اعتراض بھی کرنا پڑے گا کہ ”یہ سب اندازے قیاس کی بات۔ ان کی تاویل کا حقیقی علم تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی کو ہے۔“ حروف مقطعات کی تاویل میں خاموش رہنا، تقدم کی ایک مثال ہے۔ خاموش رہنے کے مقام پر خاموش رہنا اور بولنے کے مقام پر بولنے کے اور بھی کئی مقام ہیں۔

11. حضور نبی پاک ﷺ کی تعظیم اور توقیر کے حکم کو ملحوظ رکھنا۔

حضور نبی پاک ﷺ کی تعظیم اور توقیر کا حکم ہے۔ ارشاد باری ہے: لَثُوْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۝ وَثُعَزِّرُوهُ ۝ وَثُوْقِرُوهُ ۝ وَثُسَبِّحُوهُ ۝ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ (سورہ الفتح 9:48) ترجمہ و تفسیر میں بھی اس امر الہی کو ملحوظ رکھنا ویسا ہی ضروری ہے جیسا کہ عام گفتگو میں۔ لیکن متوجہین اور مفسرین کرام میں سے اکثر سے ملحوظ رکھنے میں نادانستہ طور پر کوتاہی کے مرتكب ہوئے ہیں۔ (اللہ انہیں معاف فرمائے۔) چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

سورہ عبس کی آیات نمبر 10-11 ”عَبَسَ وَتَوَلَّ ۝ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى ۝ وَمَا يُدْرِيَكَ لَعَلَّهُ وَبِرَّكَي ۝ ۝۔ اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا؛ جب نایبنا اس کے پاس آیا۔ اور تمھیں کیا معلوم کہ وہ ترکیہ پانے والا ہوتا۔۔۔“ (سورہ عبس 80:10-11) کی تفسیر کے حوالے سے ایک مثال ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ یہاں تو خطاب بھی صیغہ واحد غائب (‘اس نے’) میں ہے۔ لیکن ایسی باتیں حضور ﷺ سے منسوب کردی گئی ہیں جو آپؐ کی شان سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتیں۔ اللہ تعالیٰ شمار العیوب ہے۔ اس نے برائی سے نفرت کرنا سکھایا ہے، بروں سے نفرت کئے جانے کو پسند نہیں فرمایا۔ سورہ عبس میں شمار العیوب نے صیغہ واحد غائب میں خطاب کر کے اپنے محبوب پاک کے کسی ماننے والے کا نام اخفاء میں رکھتے ہوئے، تبلیغ دین کے کام میں اسکی اصلاح اور مبلغین کو تبلیغ حق کا علم عطا فرمانا پسند فرمایا۔ لوگوں نے اپنی کم نہیں سے وہاں نام رکھ دیا۔ کیا یہ اللہ اور اسکے رسول سے تقدم نہ کرنے کے حکم کی خلاف ورزی نہیں! (سورہ الحجرات 1:49) اور نام بھی اس ذات اقدس ﷺ کا جو معیار مطلق ہے حسن عمل کا، جو اللہ کا بھیجا ہوا مطلق معیار ہدایت ہے۔ کیا یہ حضورؐ کی تعظیم اور توقیر ملحوظ رکھنے کے حکم الہی (سورہ الفتح 9:48) کی صریح خلاف ورزی نہیں! جس ذات اقدسؐ کی اطاعت، اللہ کی اطاعت کی سند ہو، اس کا نام اس طرح لینا انتہائی خلاف ادب نہیں ہو گا کیا!

اسیہ ان جنگ بدروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا تھا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن حضور ﷺ کی طرف سے انھیں فدیہ لیکر چھوڑنے، ان کی مالی استطاعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں رعایت دینے، تھی دامن قیدی جو پڑھنا لکھنا جانتے تھے، انھیں دس، دس مسلمان بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کی شرط پر رہا کرنے کا جو فیصلہ کیا گیا، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے اللہ نے اسے سخت ناپسند فرمایا اور اس پر آیت عتاب نازل ہوئی۔ (ایام جبیب ﷺ، 504) اس طرح کی روایت گھرنا، ذخائر حدیث میں شامل کرنا اور تردید اور تکذیب کرنے کے بجائے تفسیر سیرت کی کتابوں میں شامل کر دینا کیا حضور ﷺ کی تعظیم اور توقیر ملحوظ رکھنے کے فرمان الہی کی خلاف ورزی نہیں! آئیے دیکھتے ہیں اس آیت پاک کا مقصد کیا ہے، اور اس روایت کا جائزہ لیتے ہیں۔ ارشادِ بانی ہے:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُمْ أَسْرَى حَتَّىٰ يُخْنَى فِي الْأَرْضِ ثُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ
الآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ ”کسی نبی کی شان کے لا اتک نہیں کہ قیدیوں کو اپنے ہاں رکھیں حتیٰ کہ زمین میں انکا خون نہ
بھائیں۔ تم لوگ اسے دنیا چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ عزت والا حکمت والا ہے۔ اگر اللہ پہلے سے ایک بات کو لکھنے
چکا ہو تا تو تم جو لینا چاہتے تھے، کے بد لے تمیں بڑا عذاب پہنچتا۔“ (سورہ الانفال 8:67)

جنگ بدروں میں جب دشمن کے قدم اکھڑ گئے، چاہئے تو یہ تھا کہ پہلے دشمن کا پچھا کر کے اس کو اچھی طرح کچل دیا جاتا اور پھر انہیں قیدی بنانے اور مال غنیمت اٹھا کرنے کو ترجیح دی جاتی، جیسے کہ سورہ محمد 4:47 میں فرمایا گیا ہے۔ لیکن اوپر بیان کردہ آیت پاک سے پتا چلتا ہے کہ ایک بڑے گروہ سے اس

معاملے میں کوتاہی ہوئی۔ بعض دیگر صحابہ نے اس بات کو ناپسند بھی فرمایا۔ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے تھا، انھیں قید کرنے سے پہلے ان کا خون بھانے کے لئے کیا کرنا چاہئے تھا، حضور اکرم ﷺ سے بہتر جانے والا کون ہو سکتا تھا! (کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔) کیا نبی پاک ﷺ سے یہ بات منسوب کی جاسکتی ہے کہ آپ اس باب دنیا کے طالب ہوئے؟ (ہرگز نہیں۔) حضور اکرم ﷺ نے ساتھیوں کو علم الہی سے نوازنے کیلئے ان کا ارادہ پوچھا، لوگوں نے اپنی سمجھ کے مطابق جو مشورے دیئے ان کا مجموعی تاثر یہی تھا کہ لوگ اب اب دنیا کے طالب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات سخت ناپسند ہوئی۔ قرآن پاک میں یہ شہادت موجود ہے کہ اللہ نے یہ لکھ دیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی موجودگی میں عذاب نہیں کیا جائے گا۔ (سورہ الانفال: 33) اور استغفار کرنے والوں پر عذاب نہیں کیا جائے گا۔ (سورہ الانفال: 33) چنانچہ حضور نبی پاک ﷺ موجودگی کی بدولت اس باب دنیا چاہئے والوں کو یقیناً بڑے عذاب سے بچالیا گیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب بات کو اگر درست مان لیا جائے تو اس سے صرف یہ پتاقلتا ہے کہ بعض صحابہ نے، جنہیں اس گروہِ صحابہ کا رویہ ناگوار گذراتھا جس نے دشمن کو کچلنے کے بجائے مال غنیمت اکٹھا کرنے اور بچے کچھ کافروں کو قیدی بنانے کو ترجیح دی تھی، مشورہ دیا کہ ان سب قیدیوں کو قتل کر دیا جائے۔ معلم کتاب و حکمت ہونا حضور ﷺ کی شان ہے۔ نبی پاک ﷺ کو اللہ کی رضا کا جو علم تھا وہ کسی دوسرے کو تو ہو نہیں سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ یقیناً بتگلی قیدیوں کے بارے میں قیامت تک یہ قاعدہ مقرر فرمانا تھا کہ انہیں قتل کر دیا جایا کرے! سورہ محمدؐ میں ارشاد ہے: "جب تم کافروں کے مقابل آجائے، تو ان کی گرد نہیں راو۔ حتیٰ کہ جب انہیں کچل چکو تو انہیں مضبوطی سے باندھ لو۔ پھر اس کے بعد احسان کرو و یافہ یہ لے لو۔" (سورہ محمد: 47) فدیہ لیکر، تھی دامن قیدیوں کو رعایت دیکر، لکھنا پڑھنا جانے والوں کو مسلمان بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کی شرط پر رہا کرنے کا فیصلہ کر کے، اسی حکم الہی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے، بتگلی قیدیوں سے حسن سلوک کے حوالے سے حضور ﷺ نے انسانیت کو وہ علم عطا فرمایا جس سے قیامت تک استفادہ فرمایا جاتا رہے گا۔ یہ روایت کہ "اللہ نے (معاذ اللہ) حضور ﷺ کے قیدیوں سے حسن سلوک کے فیصلے کو سخت ناپسند فرمایا اور اس پر آیت عتاب نازل ہوئی" اسے گھڑنے والوں کی منافقت کتب حدیث، تفسیر اور سیرت میں، اس کی تکذیب اور تردید کرنے بغیر روایت کرنے والے محدثین، مفسرین، اور محققین کی حضور ﷺ کی تعظیم اور تو قیر کے حکم الہی کو ملاحظہ رکھنے میں نادانست سخت کوتاہی کو ظاہر کرتا ہے۔ (اللہ انہیں معاف فرمائے۔) حضورؐ اور دیگر انبیاء کرام کی تعظیم اور تو قیر کرنے کے حکم الہی کو حدیث، تفسیر، کتب سیرت میں ملاحظہ رکھنا بھی دیسے ہی لازم ہے جیسے عام گفتگو میں۔ اسکے بغیر آیات قرآن کے مقصد کو پانا ممکن ہی نہیں۔ آواز حق کے مقابل اپنی آوازوں کو پست رکھنا۔

ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقُولِ كَجَهْرٍ
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالَكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿١﴾ اے ایمان والو! تم اپنی آوازوں کو نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کیا کرو، اور نہ آپ کو اس طرح بلند آواز سے پاکرا کرو جیسے ایک دوسرے کو پاکارتے ہو، ایمان ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمھیں شعور بھی نہ ہو۔ (سورہ الحجرات: 24)

آوازِ حق کے مقابل اپنی آواز کو پست رکھنا ادب ہے، اور آوازِ حق کے مقابل اپنی آواز کو بلند کرنا لقدم ہے۔ سائنسی اور فلسفیانہ علوم کو سیکولر نالج قرار دیکریا کہ ان علوم میں تحقیق کرنے میں حضور ﷺ کے اتباع کے ہم مکلف نہیں، شان رسالت کو ذات اقدس حضرت محمد ﷺ کی محض ایک حیثیت قرار دینا اور یہ کہنا کہ آپ کی محض اسی حیثیت میں کئے گئے امر کی اطاعت اور اتباع کے ہم مکلف ہیں، 'سائنس و فلسفہ' اور مکلام الہی، میں تناقض (conflict) کی صورت میں کلام الہی کو استعاراتی تعبیر (metaphorical interpretation) کے ذریعے کائنات کی سائنسی تعبیر کے مطابق بنانے کا اصول پیش کرنا جو قرآن پاک کی تعبیر کو، نیچر کی سائنسی تعبیر کے تابع کر دیتا ہے، کیا آوازِ حق کے مقابل اپنی آوازوں کو بلند کرنا نہیں!

12. تفسیر قرآن، لغت اور گرامر کے تابع نہیں ہونی چاہئے کہ حداث علم سے علم الہی کو جانچنا بے جا ہے۔

بالعلوم اس طرح کی باتیں کی جاتی ہیں:

"کہ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے جسے فصاحت و بلاغت، قواعد و معانی اور علوم و معارف کی زبان کہا جاتا ہے۔ اس کے ایک ایک

لفظ میں کئی کئی معانی پہنچا ہیں۔ فہم قرآن کیلئے اس زبان کے قواعد کی معرفت کے علاوہ دیگر ناگزیر علوم مثلاً شان نزول، ناخ و منسوخ،

حدیث، علوم حدیث، اقوال صحابہ، تاریخ و ثقافتِ عہد نبوی اور لغت عرب کے ساتھ ساتھ محاورہ عرب کی معرفت از حد ضروری ہے۔ ان کے بغیر قرآن پاک کے معنی و مراد، نظم و اسلوب اور اس کے مفہوم و مدلول کو نہیں سمجھا جاسکتا۔"

۱۰

"اہل فن نے تفسیر کیلئے پندرہ علوم پر مہارت ضروری بتلائی ہے۔ یعنی لغت، نحو، صرف، اشتھاق، علم معانی، علم بیان، علم بدیع، علم قراءت، علم عقائد، اصول فقہ، اسباب نزول، ناخ و منسون، علم فقہ، احادیث ۔۔۔۔۔ پندرہوائے علم وہی ہے جو حق سمجھانے و لفتس کا عطا یہ خاص ہے۔"

حال پر عالم اسلام کے کوئی جیید علماء کرام ہیں، جن کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ ان تمام علوم بلکہ ان کے علاوہ جدید علوم کے بھی ماہر ہیں۔ مسلم تہذیب کی قرون اولیٰ، قرون وسطیٰ کے معتزلی، اشعری متكلّمین، فلاسفہ، صوفیاء اور ماضی قریب اور حال کے اہل حدیث اور منکرین حدیث، دیوبندی اور بریلوی، مودودی، غامدی، منہاج القرآن، تنظیم اسلامی، چکڑالوی، پرویزی، آغا خانی، وحدت الوجودی اور وحدت الشہودی فرقوں کے زعماء میں سے کون ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان علوم کے ماہر ہونے کے مدعا نہیں تھے یادعی نہیں ہیں! احمدی فرقے کابانی، جھوٹا مدعی نبوت، مرزا غلام احمد، کیا ان علوم پر مہارت کے دعووں سے خالی تھا۔ کیا اس کے جاشین ان علوم پر مہارت کا دعویٰ نہیں رکھتے۔

تفسیر قرآن کیلئے لازم تھائی گئیں تمام مہارتیں، حادث علوم ہیں، علوم کسب ہیں، اور جب تک آپ ان حادث علوم کو، علم الہی سے نازل شدہ کلام اللہ کو، جانچنے کا معیار بناتے رہیں گے، کبھی بھی تفریق سے نکل سکیں گے نہ قرآن پاک کے مقصود کو پاسکیں گے۔ قرآن پاک کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اسے عربیء مبین میں نازل فرمایا۔ (نَزَّلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١﴾ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذَرِيْنَ ﴿٢﴾ بِلِسْانٍ عَرَبِيًّا مُبِيِّنًا ﴿٣﴾ سورہ الشعرا، ۱۹۵-۲۶:۱۹۳) جب تک کلام اللہ کی عربیء مبین کو کلام اللہ کو سمجھنے کیلئے معیار نہیں بنایا جائے گا، قرآن پاک کے مدعای کوپانا ممکن نہیں۔ جب تک قرآن پاک کو تضاد سے پاک کلام مان کر آغاز نہیں کیا جائے گا، زبان کے قواعد عربیء مبین سے اخذ نہیں کئے جائیں گے، آیات قرآن کے پیغام کو محدود کرنے کے بجائے، اس کے دوام کو ملحوظ نہیں رکھا جائے گا، بنی اسرائیل کی روایات اور قرآن پاک میں وقفت لازم کے عدم لحاظ سے بچا نہیں جائے گا، فرمان الہی کے حاصل پر نظر نہیں رکھی جائے گی، فرمان الہی کا حاصل بہتر جانے والوں سے سیکھنا اور کم جانے والوں کو سیکھانا مقصود نہیں ہو گا، تضاد سے دوچار ہونے کی صورت میں اس کا مأخذ قرآن پاک کے اندر دیکھنے کی بجائے، بعض آیات کو ناخ۔ منسوخ فراردینے کی بجائے، اپنے گمان کو حق کا درجہ دینے کی بجائے، فرمان الہی "فَوَقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ" اور (سورہ یوسف ۱2:76) اور فَإِنَّا لَوِيْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿7﴾ (سورہ الانبیاء ۲1:7) کے مطابق اینے سے کسی بہتر جانے والے کو تلاش کر کے، دل و دماغ کے اطمینان کو یا کرتی تغیریں بیان نہیں کی جائے گی، فرمان الہی کے مشاء کو بیانا ممکن نہیں ہو گا۔

13. قرآن کریم کا اسلوب تقریبی سے تحریری نہیں۔ صبغہ واحد حاضر 'ہا' صبغہ واحد غائب 'میں خطاب۔

قرآن پاک کے ترجمہ اور تفسیر میں بھی اس امر الٰہی کے اطلاق کا دھیان رکھنا نہایت ضروری ہے۔ قرآن پاک کا نزول تقریری اسلوب میں ہوا ہے، علم الٰہی کی رہنمائی میں حضور نبی کریم ﷺ نے اسے تحریری شکل میں منضبط کیا ہے۔ تحریری اسلوب میں خطاب کرنے والا صیغہ واحد حاضر (تو) میں خطاب کر کے اپنے مخاطبین کے ایک ایک فرد کو خطاب کر لیتا ہے۔ قرآن پاک نبی پاک ﷺ پر ضرور نازل ہوا ہے، لیکن یہ آپ کیلئے نازل نہیں ہوا۔ آپ کو تو بھیجا ہی "ہدایت اور دین حق کے ساتھ" گیا ہے۔ نزول قرآن نے تو آپ ﷺ ہی کے قول، عمل، علم اور اخلاص کی قدریق فرمائی ہے۔ قرآن پاک کے تقریری اسلوب کا دھیان نہ رکھنے والوں سے، تحریری اسلوب کے قواعد کا اطلاق کرتے ہوئے، حضور نبی کریم کی تعظیم اور توقیر کے حکم کو لمحظار کھنے میں بہت سارے مقامات پر نادانستہ کوتاہی ہوئی ہے۔ (اللہ انہیں معاف فرمائے) لیکن جس ترجمہ و تفسیر میں تفسیر قرآن کے کسی اصول کا ادراک کرنے یا اسے لمحظار کھنے میں کوتاہی ہوگی، وہ ترجمہ و تفسیر ناقص ٹھہرے گا، کئی تضادات جنم لیں گے جن کا حل تلاش کرنا ممکن نہیں رہے گا۔

اس کی دو مثالیں بیان کی جاتی ہیں: سورہ البقرہ میں فرمایا گیا ہے:

”حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، تو شک لانے والوں میں سے نہ ہو۔“ (ابقرہ 2:147)

یا سورہ الصھی میں فرمایا گیا ہے:

وَوَجَدَكَ ضَالًاً فَهَدَىٰ ﴿٧﴾ ”اور تجھے گمراہ یا توہدایت نہ دی۔ (سورہ الحجہ ۹۳:۷)

ہر ہر فرد کے سامنے حق کو روشن کیا جا رہا ہے۔ سورہ البقرہ کی آیت نمبر 198 میں فرمایا گیا ہے ”یاد کرو جیسے اللہ نے تم سب کو بدایت دی، اور اس قبل تم گمراہ تھے۔“ شان رسالت پیش نظر ہو تو واحد حاضر کے صینے میں صرف حضور ﷺ ہی کیوں کر مخاطب نظر آئیں گے۔ قرآن پاک کی درج ذیل آیت ملاحظہ فرمائیے:

”وہی ہے جس نے اپنے رسول کو بدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا کر اسے سب دنیوں پر غالب کرے۔ اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔“
(سورہ الصف 61:9 سورہ التوبہ 9:33) اسی طرح فرمایا گیا: ”ہم نے آپ کو شاہد بنائے بھیجا، بشارت دینے والے اور انذار کرنے والے۔“
(سورہ الاحزاب 33:45 سورہ لفظ 48:8) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ”اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔“
— اور اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دیتا ہوں جس کا اسم شریف احمد ہے۔“ (سورہ القف 61:6) فرمایا گیا: ”محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ آپ کی معیت میں ہیں کافروں پر شدید اور آپس میں رحم کرنے والے ہیں۔ تم ان کو دیکھو گے، رکوع کرتے ہوئے، سجدہ کرتے ہوئے۔ اللہ کا فضل اور اسکی رضاچاہتی ہیں۔ انکی نشانی ان کے چہروں پر سبود کے اثر سے ہے۔ یہ توصیف ان کی تورات میں ہے۔ اور انجلیل میں ان کی مثل یوں ہے۔“ (سورہ لفظ 48:29) فرمان اللہ ہے: ”اور ہم نے آپ کو رحمت اللعلیمین بنائے کر بھیجا ہے۔“
”(اللہ نے نبیوں سے بیثاق لیا کہ جو کتاب و حکمت تھیں عطا ہوا سکی تقسیم کرو، پھر رسول تمہارے پاس تشریف لائے کہ جو تمہارے پاس ہے اس کی تصدیق فرمائے، تو تم ضرور آپ پر ایمان لانا اور آپ کی نصرت کرنا۔“ ()

جس کی یہ شان بیان کی گئی ہے، کیا صیغہ واحد حاضر میں بیان کی بنا پر سورہ البقرہ 2 آیت نمبر 147 اور سورہ الحج 93 میں خطاب کو اس ذاتِ اقدس سے منسوب کیا جاسکتا ہے جسے رحمت اللعلیمین بنائے کر بھیجا گیا ہے، جسے بدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا گیا، جس کے بارے میں تمام انبیاء سے بیثاق لیا گیا، جس کے شرف و کرم کا تمام انبیاء و رسول اعلان کرتے چلے آئے، جس کا اسم گرامی آپ کی تشریف آوری سے صدیوں پہلے انجلیل میں، اور آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی توصیف توریت اور انجلیل میں بیان کر دی گئی، جس کے ہاتھ کو اللہ نے اپنا ہاتھ قرار دیا، جس کے قدم مبارک سے قدم آگے بڑھانے کو اللہ نے اپنے سے قدم فرمایا، جس کے قلب مبارک پر قرآن پاک کا نزول فرمایا گیا، جس کی زبان اقدس کے بارے میں فرمایا گیا کہ ”آپ تو خواہش نفس سے بات ہی نہیں کرتے، وہی کہتے ہیں جو آپ پر وحی کی جاتی ہے۔“ جس کی تعظیم اور توقیر کا اور جس کے سامنے اپنی آوازوں کو پست رکھنے کا حکم دیا گیا، کتنی بے سمجھی کی بات ہے کہ ”حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، تو شک لانے والوں میں سے نہ ہو۔“ (البقرہ 2:147) یا ”اور تجھے گمراہ پایا تو بدایت نہ دی۔“ (الحج 2:93) یا ”اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا جب نایبنا اس کے پاس آیا۔“ (عبس 80:1) اور ایسی دیگر آیات میں خطاب کا انتساب حضور ﷺ کی ذات اقدس سے تصور کیا جائے۔

علم کے مقام سے تفسیر بیان کرنے کا حکم ہے۔

ارشاد باری ہے

: يَأَيُّهَا الَّذِينَ أَمْنَوْا لِمَ تَقْعُلُونَ مَا لَا تَقْعُلُونَ ﴿١﴾ كُبْرَ مَقْتَنًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَقْعُلُونَ ﴿٢﴾

”اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بیزاری کی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم کرتے نہیں۔“ (سورہ الصف 61:2-3)

یہ حکم صرف فرد کیلئے ہی نہیں ہے۔ اس میں مفسرین قرآن کا اصول بھی دیا گیا ہے۔ قرآن پاک قول ہے۔ عمل کے بارے میں حکم ہے کہ ”اباع اس کا کر جو میری طرف رجوع لارہا ہے۔“ تزکیہ و تصدیق یافتہ کا اتباع، عمل کا مقام ہے۔ عمل کے بعد حاصل ہونے والی کیفیت کا نام علم ہے۔ علم کے مقام سے بولنے کا حکم ہے۔ عمل سے پہلے جو کچھ ہوتا ہے وہ صرف قول / انفار میشن ہوتا ہے، علم نہیں ہوتا۔ علم سے تفسیر بیان کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ فرمان اللہ ہی پر اپنے عمل کا حاصل بیان کیا جاتا ہے تاکہ شک کی گنجائش نہ رہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو تفسیر قرآن کا اصول نہیں سمجھتے، وہ صرف قیاس آرائیوں کو علم سمجھتے ہیں، ان کا اتباع کسی نظر سے خالی نہیں ہوتا۔

14. اختلاف رائے کے احترام کا اصول۔

ارشاد باری ہے:- **وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ** ﴿٢٠﴾۔ اور کچھ لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ بغیر علم کے، بغیر ہدایت کے اور بغیر کتابِ منیر کے۔ (سورہ لقمان، ۲۰) اور کوئی آدمی اللہ کے بارے میں ایسے جھگڑتا ہے، بغیر علم کے، ہدایت کے، اور کتابِ منیر کے۔ (سورہ الحج، ۲۲)

عمل کے بعد کی کیفیت کا نام علم ہے۔
ہادی کے اتباع کا حاصل ہدایت ہے۔
کتابِ منیر تو ہے ہی الحق۔

قرآن پاک قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، اسماء، شان اور نازل کردہ ہدایت کے بارے میں وہی بات علم اور ہدایت کی ہو گی جس کی تصدیق کتابِ منیر کرے گی۔ صاحب تفسیر کا کام یہ ہے کہ وہ تفسیر قرآن کے قرآنی اصولوں کی رہنمائی میں اپنا حق ادا کرنے کے بعد اللہ کا شکر بجالائے۔ اور اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ "سبھ آتے آتی ہے" اختلاف کرنے والوں کو تدبیر کا موقع دے۔

15. خلاف سیاق و سبق (out of context) تفسیر کر کے اپنی تجویز داخل کرنے سے گریز۔

کلام اللہ میں اپنی تجویز داخل کرنے کے لئے کسی آیت مبارکہ کے صرف بزو کی یا پوری آیت کی خلاف سیاق و سبق تفسیر کرنا، قرآن پاک میں معنوی تحریف کرنے کے متراود ہے۔ صلاح الدین ایوبی صاحب کے مطابق وحدت الوجود مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے فلاسفہ اور صوفیاء اپنے مسلک کی تائید میں قرآن پاک کی جو آیات پیش کرتے ہیں ان میں سے ایک سورہ الحدید ۱۵۷ آیت نمبر ۳ "هُوَ الْأَوَّلُ وَالآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالبَاطِنُ وَهُوَ إِلَكُّنْ شَيْءٍ عَلَيْمٌ" ﴿٣﴾ ہے جسے وہ سیاق و سبق سے کاٹ کر وحدت الوجود کی حمایت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اسکی تفسیر اس طرح کرتے ہیں:

"پہلے صرف اللہ تعالیٰ تھا (الاَوَّلُ)"۔ پھر وہ کائنات کی صورت میں ظاہر ہو گیا (الظَّاهِرُ)۔ پھر ایک وقت آئے گا (الآخِرُ) جب صرف اسکی ذات رہ جائے گی۔ وہ پہلے بھی پوشیدہ تھا، ایک بار پھر پوشیدہ (البَاطِنُ) ہو جائے گا۔ (شریعت و طریقت، باب وحدت الوجود کی تحقیق)

ایوبی صاحب نے بجا طور پر بتایا ہے کہ سورہ الحدید کی اس آیت پاک کے سیاق و سبق میں سات آیات قرآنی میں اللہ اور کائنات کے درمیان عبد اور معبود، خالق اور مخلوق کا حقیقی رشتہ کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ سیاق و سبق میں رکھتے ہوئے اور تفسیر قرآن کے قرآنی اصولوں کے مطابق اس آیت پاک کی تفسیریوں بنتی ہے:

وحدت (تجانیق کائنات) سے پہلے احادیث کا مقام تھا۔ احادیث کے مقام پر تعلیم کی ابتداء نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ تب بھی تھا۔ وہ اول ہے۔ ہر ابتداء کے ساتھ ابھی تعلق رکھتی ہے۔ ابتداء کے تمام مقالات کے بعد بھی اللہ ہی ہے۔ تخلیق میں اپنی نشانیوں کے ساتھ جس قدر وہ ظاہر ہے، اس قدر کوئی ظاہر نہیں ہے۔ اور ہر شے کی مقصدیت کو رکھنے والے کی حیثیت سے، جس قدر وہ باطن ہے، اس قدر کوئی باطن نہیں ہے۔ اور ہر شے کی تخلیق سے لیکر اسکی ابتداء سب کچھ جانتا ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے۔ (ماخوذ از تفسیر فاضلی منزل ہفتہ)

کسی آیت پاک کے جزا یا پوری آیت کو سیاق و سبق سے کاٹ کر فرقہ وارانہ عقائد کی تائید میں پیش کرنا، تفرقہ پرستوں کا کثرت سے استعمال کیا جانے والا طریقت ہے۔ تقریباً تمام فرقے اپنے فرقہ وارانہ عقائد کی حمایت میں کہیں نہ کہیں اس طریقے کو استعمال کرتے ہیں۔ فرمانِ الہی کو اپنی خواہشات کے مطابق بنانا فتن ہے، اور فاسق کوہی اللہ گمراہ کرتا ہے۔

آئیے اوپر بیان کئے گئے تفسیر قرآن کے قرآنی اصولوں اور مقصد قرآن لغت کے تصور کی روشنی میں چند اہم اصطلاحات کا جائزہ لیتے ہیں جنہیں جناب ایوبی صاحب نے اس کتاب میں موضوع تحقیق بنایا ہے۔

شریعت، طریقت، معرفت

ایوبی صاحب شریعت کو پورا دین سمجھتے ہیں۔ سورہ الحج ۷۲ آیت نمبر ۱۶ کے اس جز "وَالَّوَ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ لَا سُقْيَاهُمْ مَاءً غَدَقاً" ﴿۱۶﴾ اور یہ طریقت پر استقامت سے رہتے تو ہم انہیں خوب سیراب کرتے۔ اور قرآن پاک کے بعض دیگر مقامات کی بنیاد پر صلاح الدین ایوبی

صاحب کا نظر یہ ہے کہ طریقت کے معنی محض راست فکر ہونا ہیں۔ ان کے خیال میں صوفیاء بالعلوم اطریقت 'کو اشیریعت' کے متوازی اور مقابل قرار دینے کی طرف مائل ہیں۔ ایوبی صاحب سمجھتے ہیں کہ تصوف کی اصطلاح میں طریقت اس طرز عمل، اور اس طریق کار کو کہتے جو شریعت کے مقرر کردہ عقیدہ و فکر اور فہم و تدبیر پر مستلزم ہو۔ جس کی اصل قرآن حکیم سے ملتی ہونے سنت ثابتہ متواترہ سے۔ اسی لئے ان کے بقول متصوفین کی 'مجوزہ اطریقت بالفعل' ایک متوازی دین ہے۔ (ص 40-41) ایوبی صاحب دیوبندی، بریلوی، الحدیث، تبلیغی جماعت، مودودی، مولانا حیدر الدین خان اور کئی دیگر مکاتب فکر کے جیڈ علماء دین اور کئی سلاسل تصوف کے اکابرین کے شریعت و طریقت پر نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے دین کی اصطلاحات کے ان معانی کو ترک کر دیا ہے جو کہ قرآن پاک کا مقصود تھا۔ اشرع کےصور کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسے وسیع تر قرآنی مفہوم 'یعنی الدین' (پورا دین) کے بجائے محمد و معانی میں استعمال کر کے فلسفے اور تصوف کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ شرع 'یعنی الدین' کے مقابل ایک نیا نظام فکر اور دین کا ایک متوازی تصور راجح کر دیں۔

"ہمیں ایوبی صاحب کی فکر کے بنیادی نکات سے قطعاً اختلاف نہیں ہے۔ ہم بھی اپنی کتابوں The Muslim Theology, Philosophy and Spirituality طبع شدہ 2016 اور "مسلم فکر کی قرآنی جہات" طبع شدہ 2018ء میں مسلم الہیات، فلسفہ، تصوف، علم و حج اور علوم کسب میں تعلق، تغیر قرآن اور تاویل حدیث، فقہ و اجتہاد، اور امت میں تفرقہ کی وجہہ اور اتحاد میں اسلامیں سے متعلق مسائل وغیرہ کا جائزہ لینے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچ ہیں کہ

ان مسائل کی بنیاد قرآنی تصورات کو قرآن پاک سے تناقض غیر قرآنی اور فلسفیانہ اصطلاحات اور نظریات سے بدل دینے، لغت قرآن کی جگہ لغت عرب کو بنیاد بنا نے، تفسیر قرآن کے قرآنی اصولوں کے بجائے غیر قرآنی اصولوں کو قبول کرنے، قرآن پاک جو کہ حکم ہے اور حقیقی اور داعی مأخذ شریعت ہے کے ساتھ حدیث پاک کو مأخذ شریعت بنادینے، حدیث پاک پر مشتمل کتابوں کو بغیر کسی الہامی اخباری کے 'اصحاح ستہ' (Six Most Rectified Compilations) کا سرٹیفیکیٹ جاری کر کے قرآن پاک کے اور اخباری بنادینے، اور صوفیاء کے کشف و شہود، شطحیات، اور ارشادات کو 'الحق' کے مقابل عقائد کے اخذ و قبول کی سند جاری کر دینے پر ہے۔ ہم حضرت فضل شاہ قطب رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کو سلام کرتے ہوئے ان کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں کہ "دین میں قرآن پاک سے تناقض اصطلاحات داخل کرنا، دین سے غداری ہے۔" (ماخوذ، سورہ الشوری 42:13-14)

ایوبی صاحب نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں شاید ہی کوئی الہیاتی، فلسفیانہ مکتب فکر یا سلسلہ تصوف ہو جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر وحدت الوجود کے اثرات سے محفوظ رہ سکا ہو۔ شیخ احمد سرہندي، جنہیں شیخ مجی الدین ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کے مقابل نظریہ وحدت الشہود کا بنی قرار دیا جاتا ہے، ان کے بعض ارشادات کو بھی وحدت الوجودی فکر سے مختلف نہیں سمجھتے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود خدا اور کائنات کے تعلق کی نوعیت پر صوفیانہ کشف و شہود کی بنیاد پر پیش کئے گئے نظریات ہیں۔ دونوں نظریات کی بنیاد پر توحید کا جو تصور پیدا ہوتا ہے، ایوبی صاحب بجا طور پر اسے توحید وجودی اور توحید شہودی کہتے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں کہ یہ دونوں، نظریات قرآن پاک کے تصور توحید سے مختلف ہیں۔ ہم نے بھی اپنی محوالہ بالا کتابوں میں قرآنی تصور توحید کو 'وحدت شاہدین' کے نام سے بیان کیا ہے۔ جناب صلاح الدین ایوبی صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ اہل اللہ کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جن کے شب و روز کے احوال اور قرآن سے تعلق ظاہر کرتا ہے کہ انکا تصوف اور وحدت الوجودیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ شرع پر قائم اور درجہ احسان پر فائز اہل اللہ ہیں۔ اصل مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب دین کے اصل فکر سے سے گریز پائی اختیار کی جاتی ہے۔ ایوبی صاحب کہتے ہیں کہ قادر یہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ تینوں سلسلے فی الاصل وحدت الوجودی ہیں۔ نقشبندیہ اور سہروردیہ سلسلوں کے بارے میں تو ہم کچھ زیادہ جاننے کا دعویٰ کرنے نہیں سکتے۔ ہمارا تعلق سلسلہ قادریہ کے ساتھ ہے۔ سلسلہ قادریہ کے بارے میں ہم اسناد کے ساتھ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ اپنی اصل کے اعتبار سے قطعاً وحدت الوجودی نہیں۔ حضرت شیخ عبدالقار جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، جو حضرت غوث اعظم کے نام سے مشہور ہیں، ان سے جس سلسلہ عالیہ کا آغاز ہوا وہ 'ازابدی قادری' کہلاتا ہے۔ حضرت سلطان با حرمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلہ میں ایک نئی ڈوبلینگ ہوتی ہے۔ آپ کے معتقدین 'سروری قادری' کہلاتے ہیں۔ سلطان العارفین حضرت سلطان با حرمۃ اللہ علیہ کے اخلاف میں دونوں طرح کے لوگ ہیں۔ بعض ان کے کلام کی وحدت الوجودی تعبیر کرتے ہیں اور بعض اسکے بر عکس انہیں وحدت الوجودی نہیں مانتے۔ ہمارا علم یہ ہے کہ آپ کے کلام کی وحدت الوجودی تعبیر قطعاً درست نہیں۔ اور بھی کئی سلاسل ہو سکتے ہیں جن کے اسلاف اسی طرح وحدت الوجودی نہیں تھے لیکن اخلاف وحدت الوجودی ہو گئے۔ حضرت فضل شاہ رحمۃ اللہ علیہ (المتومنی 1978ء) جن کا مزار شریف

مسجد عرفان، نور والوں کا ڈیرہ پاک 'افنٹری روڈ لاہور پر واقع ہے، قادری تھے۔ آپ سے قادری سلسلے میں ایک نئی شاخ کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ کے خلفاء قادری فاضلی اور قادری کہلاتے ہیں۔ حضرت فضل شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حیات طیبہ کے آخری سالوں میں تجد کے وقت قرآن پاک پر بیان دینے کا سلسلہ شروع کیا ہے آپ کے حکم سے آپ کے دو عقیدتمند جناب غلام رحمن المعرف سیکریٹری صاحب اور جناب محمد اشرف فاضلی صاحب ضبط تحریر میں لایا کرتے۔ پورے قرآن پاک پر آپ کے کام آپکی زندگی میں مکمل ہو گیا ہے آپ کی وصیت کے مطابق جناب محمد اشرف فاضلی صاحب (المتومن 2016ء) نے اپنے نوٹس کی مدد سے سات منازل پر مشتمل تفسیر فاضلی کی صورت میں 1998ء سے 1982ء کے دوران شائع کیا۔ پانچ منازل کی انگلش ٹرنسلیشن بھی شائع کی جا چکی ہے۔ باقی دو پر کام ہو رہا ہے۔ تفسیر فاضلی ہماری معلومات کے مطابق پورے قرآن پاک کی واحد تفسیر قرآن بالقرآن ہے جواب تک لکھی گئی ہے۔ حضرت فضل شاہ وحدت الوجودی قلعائیں تھے۔ تفسیر فاضلی میں سورہ الزخرف 43 کی آیت نمبر 16 (وَجَعْلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكُفُورٌ مُّبِينٌ ﴿١٦﴾) اور ان لوگوں نے اللہ کے بندوں کو اللہ کا جز بھرایا۔) کی تفسیر کرتے ہوئے 'وحدت الوجود' کے تصور اللہ کو خلاف حق قرار دیتے ہیں۔ تفسیر فاضلی کی پہلی منزل کے شروع میں حضرت فضل شاہ کے ارشادات میں آپ کا ارشاد کہ "وحدت الوجود تو حید کفر ہے۔" شامل ہے۔

وحدت الوجود، وحدت الشہود اور وحدت شاہدین

یہ نظریہ کہ اللہ تعالیٰ وجود مطلق ہے اور باقی ہر شے اسکا اظہار، مسلم فکر کی تاریخ میں 'وحدت الوجود' (Doctrine of the oneness of all being/existence) کہلاتا ہے۔ وحدت الوجود کی بنیاد و مفروضوں پر ہے۔ اللہ کو 'الحق' کہنا اور 'الحق' کو 'الله' کے خصوصی نام کی حیثیت سے لفظ 'الله' کے مترادف استعمال کر کے اللہ کو حقیقت، مطلق حقیقت، صداقت، یا مطلق صداقت (The Ultimate Reality, The Reality, Ultimate Truth) اور کائنات کو اضافی حقیقت (relative reality) قرار دینا وحدت الوجود کی مکتب فکر کے دو بنیادی مفروضات میں سے ایک ہے۔ قرآن پاک کے 'الحق' ہونے کے حوالے سے ہم بہت تفصیل سے اس بات کا جائزہ لے چکے ہیں کہ یہ مفروضہ سورہ محمد آیت نمبر 2 میں اللہ کے اس فرمان "بِمَا نَزَّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ۔ ﴿٢﴾" میں "محمد ﷺ پر جو نازل فرمایا گیا ہے، وہی ان کے رب کی طرف سے 'الحق' (معیار حق) ہے۔" اور دیگر بہت سی آیات سے متصادم ہے، لہذا صریحاً خلاف حق ہے۔ قرآن پاک 'الحق' ہے اور اللہ 'الحق' کا نازل فرمانے والا۔ دونوں کو 'الحق' نہیں کہا جاسکتا۔

'وحدت الوجود' کو اس طرح بھی پیش کیا جاتا ہے کہ اللہ وجود مطلق (Absolute Existence) ہے اور تمام کائنات وجود مطلق کے اختیار کئے ہوئے عارضی تعلیمات، جن کا آغاز بھی ہوتا ہے اور انجام بھی۔ تمام اشیاء ظاہر اُ حقیقی ہیں لیکن اپنی ماہیت (essence) میں وجود مطلق کا اظہار۔ اپنے انعام پر یہ پھر اپنی اصل میں مل جاتی ہیں۔ 'وجود' عربی زبان کا لفظ ہے اور 'ووج' دمادے سے اسکا تعلق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں وجود مطلق ہوتا تو عربی زبان میں نازل فرمائے گئے قرآن پاک میں اس بات کو بیان کر دینے میں کیا مشکل تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات اقدس کے بیان میں 'وجود' یا اس مادے کا کوئی دیگر لفظ مثلاً 'موجود' یا 'غیر موجود' وغیرہ استعمال کرنا پسند کیا ہے کیونکہ اغذیہ کیا جاسکتا ہے۔ کیا کوئی دوسرا شخص اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کو اللہ سے زیادہ جان سکتا ہے۔ اپنے کشف و شہود کو معیار حق کا درجہ دیکر اللہ تعالیٰ، اس کی ذات، صفات، شان اور اسماء الحسنی سے اپنی بات منسوب کرنا جو قرآن پاک سے متناقض ہو، کیا افڑتی (concoction) نہیں ہے!

اس مکتب فکر کی طرف سے پیش کیا گیا دوسرा مفروضہ، جو ان کے پہلے مفروضہ پر ہی استوار ہے، یہ ہے کہ خدا کائنات سے تنزیہ (transcendence) اور تشبیہ (immanence) دونوں نوعیت کا تعلق رکھتا ہے۔ خدا، کائنات میں سریانی (Immnant) ہی ہے، اور اس سے ماوراء (Transcendent) بھی۔ یعنی کائنات تو اپنی ماہیت میں خدا ہی کا ظہور ہے، لیکن خدا کائنات سے ماوراء بھی ہے۔ جب پہلا مفروضہ (کہ اللہ 'الحق' ہے۔) ہی صریحاً قرآن پاک سے متناقض ہے، تو اس پر استوار دوسرے مفروضے کے درست ہونے کا سوال ہی کب پید ہوتا ہے۔

ولیم سی چک کہتا ہے:

Ibn Arabi is not a philosopher, but a sage, a visionary and wahdat al-wujud is one of the many "dimensions of his overall vision of reality which Ibn Arabi wants to convey to his reader. He further observes: "one of Ibn Arabi's themes is that reason or intellect ('aql) is inadequate as a source of" (The Mujaddid's Concept of Tawhid, 9). knowledge of God, the self, and the world

چیک کے درج بالا بیان سے ظاہر ہے کہ شیخ محبی الدین ابن عربی کے نزدیک اسکا اپنا وہنہ ہی معیار حق ہے۔ اسکے مکتب فکر کے بارے میں بھی یہی بات درست ہے۔ قرآن پاک شہادت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بے مثل اور کیتا (Singularly and Supremely Unique) ہے۔ اللہ کی ذات اقدس کے بارے میں اپنے وہنہ، ذوق، یا کشف و مشاہدہ کو اتنی اہمیت دے دینا کہ اسے حق کا درجہ دے دیا جائے جبکہ اللہ نے اس کے لئے کوئی سند نازل نہ کی ہو تھا خلاف حق ہے۔ (اقرآن، 7:21) حضرت شیخ احمد سرہنڈیؒ نے اپنے کشف و مشاہدہ کو بنیاد بناتے ہوئے فرمایا کہ 'وحدت الوجود، منازل سلوک پر محض ایک مقام ہے۔ لیکن یہ آخری منزل نہیں اور نہ ہی یہ درست تصور الہ ہے۔ شیخ احمد سرہنڈی نے فرمایا کہ درست بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، الہ ہے اور ہم اسکے بندے، وہ خالق ہے اور کائنات اسکی تخلیق، اور تخلیق قطعاً پنے خالق کی الوہیت میں کسی بھی طرح شریک نہیں، نہ اسکے اظہار کی صورت میں اور نہ اسکی تجلی کی حیثیت سے۔ 'تخلیق، حقیقت ہے، لیکن 'خالق' اس سے مطلق طور پر ماوراء ہے۔ شیخ احمد سرہنڈی کے نظریہ کو 'وحدت الشہود' (doctrine of the shahadah) کی حیثیت سے۔ تخلیق، حقیقت ہے، حضرت فضل شاہؒ نے فرمایا کہ مشاہدے کا ایک مقام ہے، جس کی تعبیر 'وحدت الوجود' (transcendental unity of all manifestation) کا نام دیا جاتا ہے۔ حضرت فضل شاہؒ نے فرمایا کہ مشاہدے کا ایک مقام ہے، جس کی تعبیر 'وحدت الوجود' کے طور پر کی جاتی ہے۔ اللہ کے فرمان سے صرف نظر کر کے اپنے مشاہدے کو حقیقت پر محمول کر کے ہی ایسا کیا جاسکتا ہے۔ بطور تصور الہ یہ قطعاً خلاف حق نظریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ وجود مطلق ہے، نہ جسم میں روح کی طرح، یا گرم لو ہے میں آگ کی طرح، یا کسی اور طرح سریانی (immortal) ہے۔ ساری کائنات اللہ کی نشانیوں سے اس طرح بھری ہوئی ہے، کہ سارے سمندر روشانی بن جائیں اور سارے درخت قلم بن جائیں، تو بھی اس کے کلمات ختم نہیں ہونگے خواہ روشنائی کے سات سمندر اور آجائیں۔ (سورہلقان 31:27) تمام ماسو، اللہ کے احاطہ علم میں بھی ہے اور احاطہ قدرت میں بھی۔ کوئی جگہ نہیں ہے جہاں اللہ نہ ہو۔ وہ خود کسی بھی شے کے ساتھ مماثلت سے مطلق ماوراء (Absolutely Transcendent) ہے۔ بندوں کو یہ کائنات کی کسی شے کو اللہ کا جز قرار دینا، قطعاً خلاف حق ہے۔ انسان کا کوئی خیال، احساس، تصور، تجربہ، تاثر، وہم، گمان، وجدان یا کشف و شہود اسکی ذات اور اسماء کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ وہ وہی ہے جو اپنے آپ کو بیان کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کے بیان میں صفت 'کافلظ استعمال نہیں' فرمایا۔ اسماء الحسنی ہی تخلیق کائنات کا اور اسماء الحسنی ہی معرفت ذات الہ کا وسیلہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر ذات و صفات کی اصطلاحات میں گفتگو، وہ اسلوب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اختیار کرنا پسند نہیں فرمایا۔ صفات الہی کے وسیلے سے تخلیق کائنات کا بیان وہ اسلوب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اختیار کرنا پسند نہیں فرمایا۔ یہ غیر قرآنی ہے اور خلاف حق ہے۔ اسکی صفات کریمہ حقیقی ہیں لیکن، اس کی ذات سے الگ طور پر اور زائد ذات نہیں۔ اسکی معرفت کا وسیلہ صرف اس کے اسماء الحسنی ہیں۔

وحدت الوجودی، خدا اور ماسو، میں تعلق کیلئے سمندر اور لہر، روشنائی اور حرروف والفاظ، جیسی تشبیہات استعمال کرتے ہیں جن کا کوئی جواز قرآن پاک سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً لہر اپنی ماہیت میں سمندر سے مختلف نہیں ہوتی۔ سمندر کا باطنی اہتزاز اس کا سبب بنتا ہے۔ لہر جب جنم لے لیتی ہے تو پھر اس کی حقیقت سے انکار کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اپنی اصل میں تو وہ سمندر ہی ہوتی ہے۔ ساحل سے تکرا کر پھر اصل میں لوٹ جاتی ہے۔ تمام حرروف، الفاظ، کتابیں، لا بسیریاں جو علوم کو منضبط کرتے ہیں، روشنائی ہی کے افتراق سے وجود میں آتے ہیں اور اصل روشنائی ہی ہوتے ہیں۔ یہ ایشاء کو خدا کا جزء قرار دینے کے مترادف ہے اور خلاف حق ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ pantheism اور وحدت الشہود ایک چیز ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ وحدت الوجود، اور وحدت الشہود مکاتب فکر ہیں جو تصوف سے تعلق رکھتے ہیں۔ جبکہ panantheism اور panatheism فلسفیانہ مکاتب فکر ہیں۔ pantheism خدا اور کائنات کو ایک دوسرے کا عین قرار دیتا ہے جیسے سپاٹوزا کا فلسفہ ہے۔ panantheism کے مطابق خدا کی ذات کے دو پہلو ہیں: سریانی (transcendent) اور مادرائی (immanent)۔ ایک پہلو سے کائنات وجود مطلق کا اظہار ہے اور وجود مطلق کائنات میں سریانی ہے۔ کائنات خدا کے ساتھ عینیت رکھتی ہے لیکن خدا کائنات کے عین نہیں کیونکہ خدا، کائنات سے ماوراء بھی ہے۔ حضرت ابن عربیؓ کا کشف و شہود پر بنی نظریہ وحدت الوجود فلسفیانہ نظریہ panantheism کے بہت قریب ہے۔

اگر حضرت ابن عربیؓ نے اپنا نظریہ وحدت الوجود اپنے صوفیانہ وہنہ اور کشف و شہود کی بنیاد پر پیش کیا تو شیخ احمد سرہنڈیؓ نے بھی اپنا نظریہ وحدت الشہود قرآن پاک کی سند کے ساتھ پیش نہیں کیا۔ انہوں نے بھی اپنے روحانی تجربات ہی کو بنیاد بنایا۔ اسلئے ہم ان کے نظریہ کو بھی درست نہیں سمجھتے۔ قرآن پاک کی سند کے ساتھ بات کی جائے تو 'وحدت شاہدین' (oneness of shahideen) صحیح نظریہ ہے۔ تمام شاہدین وجود واحد ہیں، کیوں کہ انکا مقصود واحد ہے، اور ان کا مقصود ہے لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف نکالنا، ان کو پاک کرنا، انکی تصدیق کرنا، ان کو کتاب و حکمت کا علم عطا فرمانا۔ اللہ تعالیٰ ہر شے کو منصہ شہود پر لانے والا (Absolute Originator) ہے۔ قرآن پاک کے مطابق ذات باری سے منصہ شہود پر آنے والی ہر چیز یا تو

اسکی 'خلق' (Creation) کی قسم سے تعلق رکھتی ہے یا اس کے 'امر' (Command) کی قسم سے۔ 'خلق' اکونویا سنوارا جاتا ہے، اور 'امر' کو پھونکا جاتا ہے، نازل کیا جاتا ہے، یا صادر کیا جاتا ہے۔ 'امر' علم الہی میں پہلے متعین ہوتا ہے، اور خلق اس امر کی مناسبت سے وجود میں آتی ہے۔ 'خلق' اس امر کو سنبھالنے کے قبل ہو جاتی ہے تو امر کو اس میں انشال کر دیا جاتا ہے۔

وحدث شاہدین کے مطابق قرآن پاک تین بنیادی تصورات: "الله، خلق اور امر" پر مشتمل وجودیات (Ontology) کا تصور دیتا ہے۔ مسلم الہیات، علم الکلام، فلسفہ، تاویل حدیث، فقہ، صوفیانہ مکاتب وحدت الوجود اور وحدت الشہود مکاتب فکر، یونانی اور غیر قرآنی نظریات کے اتباع میں دونیادی تصورات، اللہ اور خلق (قدیم اور حادث) پر مشتمل وجودیات پر استوار ہیں۔ مسلم تہذیب و ثقافت کے بہت سے علمی اور عملی مسائل اس سے بھی پیدا ہوئے ہیں۔ ہم دین میں کسی نئے کتب فکر کی بنیاد رکھنے کو قطعاً مناسب نہیں سمجھتے۔ تاہم قرآن پاک کے لفظ 'شاہد' کو اسلام میں روحانیت کا ماغذہ قرار دینے، اپنے کشف و مشاہدہ کو حق کا درجہ دینے، اسکی تاویل اپنے گمان کے مطابق کرنے کے بجائے قرآن پاک کی سند، اور اللہ، خلق اور امر پر مشتمل وجودیات پر استوار کرنے کو وحدت شاہدین، کہنا موزوں سمجھتے ہیں۔

سلسلہ قادریہ کاموّقف

آئیے حضور حضرت فضل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے تفسیر فاضلی کی صورت میں شائع شدہ بیان کی روشنی میں شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے تصورات پر سلسلہ قادریہ کاموّقف جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

شریعت اور طریقت مانے کے درجے ہیں۔

شریعت، قول ہے اور بدایت، رہنمائی، اصول، احکام وغیرہ پر مشتمل ہے۔

قرآن پاک ماغذہ شریعت ہے۔

شریعت، خلق نہیں، اللہ کا امر ہے جو کا اتباع ضروری ہے۔

شریعت کی حقیقت شاہراہ ہے۔

فرمانِ الہی ہے:- **إِلَّا جَعَلْنَا مِنْكُمْ شُرْعَةً وَمِنْهَا جَاءَ**۔ "ہم نے تم میں سے ہر ایک کو ایک دستور (شریعت) اور راستہ (منہاج) دیا۔ اور اللہ چاہتا تو تم کو ایک امت ٹھہرایا۔" (سورہ المائدہ: 48) مزید فرمایا: **ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِنَ الْأَمْرِ فَإِنِّي أَنْهَاكَمْ** ﴿٦﴾ "پھر ہم نے تمھیں (اپنے) امر سے شریعت پر ٹھہرایا، تو اسی کا اتباع کرو اور بے علم لوگوں کی خواہشات کے پیچے نہ لگو۔" (سورہ الباجیہ: 45:18)

شریعت (دستور) فرمانِ الہی اور منہاج اس حکم کو جاری کرنے والے کے نقش قدم کا نام ہے۔ بے علم لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں۔ بے علم لوگوں کی بات ہمیشہ بے سند ہوتی ہے۔ جو شریعت پر عمل پیروی ہوتا ہے جیسے وہ پسند کرتا ہے، وہ صرف اپنی ہی پسند ناپسند کا اتباع کرتا ہے، وہ بے علم لوگوں کی خواہشات کے پیچے لگتا ہے۔ وہ اللہ کے امر کو نہیں مانتا۔ ایسا شخص رسوم دین میں بڑی مہارت بھی حاصل کر لے، کبھی دین کی روح کو نہیں پا سکتا۔

طریقت کی حقیقت اتباع ہے۔ شاہد کے اتباع میں شریعت پر عمل کرنا، طریقت ہے۔

امرِ الہی ہے:- **وَإِنَّمَا سَبِيلُ مَنْ أَنْابَ إِلَيْيَ**۔ "... اور اتباع اس کا کر جو میری طرف رجوع لارہا ہے۔" (سورہ لقمان: 15:31) اللہ کی طرف رجوع لانے والے تصدیقیافتہ بندے (مخلص / شاہد) کے اتباع میں شریعت پر عمل کرنا طریقت ہے۔ طریقت وہ معیار ہے جو حق کے حوالے سے قائم ہے۔ ارشاد ہے: **وَأَلَّا اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ لَا سُقِينَاهُمْ مَاءَ عَذْقاً** ﴿١﴾ اور یہ طریقت پر استقامت سے رہتے تو ہم انہیں خوب سیر اب کرتے۔" (سورہ الحج: 72:16) اتباع کبھی ایک سے زیادہ کا نہیں کیا جاسکتا۔ جو ایک سے زیادہ کا اتباع کرتا ہے، صرف اپنے آپ کو مانتا ہے۔ جس نے اپنی زندگی میں خود کسی کا اتباع نہیں کیا، اس نے اللہ کے فرمان کو نہیں مانا، وہ قبل اتباع نہیں ہو سکتا۔ جوں کی ایک جماعت نے قرآن پاک سناؤ وہ ایمان لے آئے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ انکا یقوق سردار اللہ کے بارے میں بے سند باطنیں کرتا رہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی اعتراف کیا: "ہم میں سے کچھ صالح ہیں اور کچھ ان کے مقابل (یعنی غیر صالح)۔ ہمارے راستے (طرائق) الگ الگ ہیں۔" (سورہ الحج: 72:11) جو حق کے حوالے سے اصلاح قبول کرتے ہیں، وہ صالح ہیں۔ جو من مانی کرتے ہیں، وہ غیر صالح ہیں۔ اس آیت پاک کے مطابق صالح اور غیر صالح کی طریقت الگ الگ ہے۔ اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت میں، شاہد کو اللہ کی

طرف رجوع لانے والا مان کر اسکے نقش قدم پر چلنے والین کی طریقت ہے۔ شریعت پر عمل پیرا ہونے میں اپنی پسند اور ناپسند کا اتباع ان کے مقابل والوں کا طریقہ ہے۔ (ماخوذ، سورہ الحجہ 11:72 اور سورہ الحم 15:31) جس کا قلب اللہ کے ذکر سے غافل ہو، جو اپنی خواہشات کی پیروی میں لگا ہوا ہو، اور جس کا کام حد سے گزر جائے، اسکی اطاعت سے منع فرمایا گیا ہے۔ اطاعت اسی کی حق ہے جس کا قلب اللہ کے ذکر سے غافل نہ ہو، جو اپنی خواہشات کی پیروی نہ کرتا ہو، اور حمد و اللہ کا احترام کرتا ہو۔ (اور اس پر شہادت موجود ہو۔) (ماخوذ، سورہ الکھف 18:28)

حقیقت کے درجے کا تعلق علم سے ہے۔

”علم ہمیشہ عمل کے بعد عطا ہوتا ہے۔“

شہد کے اتباع میں شریعت پر عمل کرنے کے بعد جو مقام آتا ہے وہ ”حقیقت“ ہے۔

معرفت، انعام ہے۔

جو قول، عمل، اور علم تینوں مقامات پر اپنے شہد کے اتباع میں پورا رہتا ہے، اسے معرفت بطور انعام عطا فرمادی جاتی ہے۔

وہ مخصوصین میں شمار ہو جاتا ہے اور مخصوصین کو شیطان بہکانہ نہیں سکتا۔ (القرآن، 38:83، 40:15)

معرفت وہ درجہ ہے جسے قرآن عرفان حق کا نام دیتا ہے۔ (القرآن، 5:83)

جسے معرفت عطا ہوئی اسے شہدین کی معیت عطا ہو جاتی ہے۔

قرآنِ پاک میں ارشاد ہے: صاحب لوگ دعا کرتے رہتے ہیں ”یا اللہ ہم اس پر ایمان لائے جو تو نے نازل فرمایا، اور رسول کے تالع ہوئے، تو ہمیں شہدین کی معیت میں لکھ لے۔“ (القرآن، 3:53)

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو سمجھانے کیلئے قرآنِ پاک میں مثالیں بھی بیان فرمائی ہیں۔ شہدین بھی فرمانِ الہی کے اتباع میں بات سمجھانے کیلئے مثالیں بیان فرماتے ہیں۔ لیکن ضروری ہے کہ مثال فرمانِ الہی سے مطابقت رکھتی ہو۔ اگر کوئی مثال یا تمثیل فرمانِ الہی سے متناقض ہے تو وہ خلافِ حق ہے اور لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف آنے میں کوئی مدد نہیں دیتی۔

حضرت فضل شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے تعلق کو واضح کرنے کیلئے اس طرح تمثیل بیان کی ہے:

”شریعت بمنزلہ دودھ، طریقت بمنزلہ دہی، حقیقت بمنزلہ مکھن اور معرفت بمنزلہ کچھ بن سکتا ہے، نہ کوئی بنا سکتا ہے۔ (تفسیر فاضلی منزل اول 1992، تعارف)

حضرت فضل شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح بھی بیان فرمایا ہے:

”شہد کا قدم علوم کا معدن ہوتا ہے۔ علم، قدم کی صفت ہے۔

شریعت، قدم ہے۔ طریقت، نقش قدم ہے۔ حقیقت قدیم ہے۔ شریعت قدم کی ابتداء ہے اور معرفت قدم کی انتہا ہے۔“ (تفسیر فاضلی منزل ہفتہ، 228)

بعض حضرات شریعت، طریقت، اور حقیقت کے تعلق کو واضح کرنے کیلئے دائرے کی تمثیل پیش کرتے ہیں۔ اس تمثیل میں دائے کا محیط شریعت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق شریعت تمام ماننے والوں کیلئے ہے اور ماننے والے دائے کے محیط پر ہوتے ہیں۔ اس دائے کے مکملہ رداں، طرائق (طریقت کی جمع) کی علامت ہیں۔ اس نظریے کے مطابق طریقت وہ رداں (radius) ہے جو محیط کے ہر برلنگتے کو مرکز سے ملاتا ہے۔ دائے کا مرکز ”حقیقت“ ہے۔ شریعت سے حقیقت یعنی دائے کے مرکز کی طرف سفر طریقت ہے۔ حقیقت خدا ہے اور خدا ہی تمام روحانی سفر کی منزل ہے۔ حقیقت (خدا)، شریعت اور طریقت کا منع ہے۔ (S. H. Nasr 1966, 128) سید حسین نصر حقیقت، صداقت، خدا اور مرکز کو ایک قرار دیتے ہیں اور یہ الفاظ متراوف طور پر استعمال کرتے ہیں۔ (S. H. Nasr, 15, 16, 17, 19, 137 etc.)۔ اس تمثیل کا ہر جز قرآنِ پاک کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اس کے مطابق دائے کا مرکز حقیقت، صداقت، یادہ ہے۔ لیکن قرآنِ پاک، اللہ کیلئے ”حقیقت“ (Reality) یا ”صداقت“ (Truth) کا لفظ کہیں استعمال کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہم دیکھے چکے ہیں کہ ”ج-ق-ق“ مادے سے مشتق کوئی لفظ قرآنِ پاک میں اللہ کے لئے استعمال نہیں ہوا۔

ذاتِ باری کیلئے دائے کی تمثیل بیان کرنے کا قرآنی حوالے سے کوئی جواہر نہیں، نہ ہی یہ اللہ کی شان کیلئے موزوں ہے۔ قرآنِ پاک میں اللہ کیلئے لفظ (point) کی تمثیل بھی بیان نہیں کی گئی۔ یہ تمثیل معرفت کا کوئی ذکر ہی نہیں کرتی۔ اور کیا بھی کیسے جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ”حقیقت“، ”قرار دے“ دینے کے

بعد مزید درجہ کون سارہ جاتا ہے۔! اگر خدا 'حقیقت' ہے تو پھر زمین و آسمان، اور جو کچھ ان کے مابین ہے یا تو بے حقیقت (appearance) ہے، یا خدا (یعنی حقیقت) کے اختیار کئے ہوئے عارضی تعبیت ہیں! یہ وحدت الوجودی تصور اللہ ہے اور اسی عقیدے کے پرچار کے لئے یہ تمثیل بنائی گئی ہیں۔ یہ تمثیل شریعت، طریقت، حقیقت کا جو تصور پیش کرتی ہے وہ خلاف حق ہے، بے سند ہے۔

اس تمثیل کے مطابق اللہ نے شریعت اور طریقت کو الگ الگ پیدا فرمایا ہے۔ ان کی یہ بات قرآن پاک سے ثابت نہیں ہوتی۔ یہ وہی بات ہے جسے ایوبی صاحب بجا طور پر ایک متوازی اور متقابل دین قرار دیتے ہیں۔ لیکن سلسلہ قادری کے بزرگ حضرت فضل شاہؑ کی تعلیمات میں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہاں تو شریعت، قدم ہے، اور طریقت، نقش قدم ہے۔ حقیقت قدیم ہے۔ شریعت قدم کی ابتداء ہے اور معرفت قدم کی انتہا ہے۔"

قرآنِ پاک شریعت اور اس پر عمل یعنی طریقت کیلئے دائرے کے بجائے، صراطِ مستقیم کی تمثیل استعمال کرتا ہے۔ سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعا سکھائی گئی ہے: "ہمیں صراطِ مستقیم کی بدایت عطا فرم۔ راہ اگلی جن پر تو نے انعام کیا۔ ان آیات کے مطابق، انعام یافتہ کے نقش قدم کا نام صراطِ مستقیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کے مرسلین میں سے ہونے اور صراطِ مستقیم پر ہونے کی شہادت دی ہے۔ (سورہ یسعیٰ: 36-4) جس کی آپ نے اپنے نقش قدم پر ہونے کی شہادت دی، وہ بھی صراطِ مستقیم پر ہے۔ اس تصدیق یافتہ شاہد سے جسے تصدیق عطا ہوئی اس کے صراطِ مستقیم پر ہونے میں بھی کوئی شبہ نہ رہا۔ یہ سب انعام یافتہ ہیں۔ صورتیں جدا جدیں، راستہ سب کا ایک ہے۔ ارشاد باری ہے: "اور جو اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کرے تو اسے اگلی میتت حاصل ہوگی جن پر اللہ نے انعام کیا۔"۔۔۔ النبیین، صدّیقین، شہداء اور صالحین۔ اور وہ کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔" (القرآن، 4:69) ان انعام یافتہ حضرات کی میتت رضائے الہی کی سند ہے۔ اس میتت کا طریق حصول یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہو۔ اللہ کی اطاعت اللہ کے رسول کی اطاعت ہی سے ثابت ہوتی ہے، اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت تابعین، ناصحین، شاہدین کی اطاعت سے ثابت ہوتی ہے۔ دعویٰ بھی حال پر ہوتا ہے، شاہد بھی حال پر ہوتا ہے اور بغیر شہادت دعویٰ قابل سماحت ہی نہیں ہوتا۔ انعام یافتہ کا اتباع خوف و حزن سے یقینی نجات کا باعث ہوتا ہے۔ (تفسیر فاضلی منزل اول 1992ء، ص 2-5، ص 6-5) خط مسقیم دونقاٹ کے درمیان مختصر ترین فاصلہ ہوتا ہے۔ تصدیق یافتہ شاہد کا اتباع منزل کے حصول کا لیقین، مختصر ترین اور محفوظ ترین راستہ ہے۔ دائے کے محیط کا نہ آغاز ہوتا ہے نہ انجام۔ محیط پر سفر کرنے والا کبھی منزل آشنا نہیں ہوتا۔ قرآن پاک میں دائے کی تمثیل 'مصائب میں گھر جانے، یا بُری گردش' کے معنی میں آئی ہے۔ کہیں پر یہ تمثیل شریعت یا اس کے طریقت اور حقیقت سے تعلق کو بیان کرنے کیلئے نہیں آئی۔ (القرآن، 6:48) یہ ہے قادری فاضلی سلسلے کی طریقت، جس کی ایک بات قرآن پاک کی سند سے مستند ہے۔ تصوف غیر قرآنی اصطلاح ہے۔ قادری فاضلی اپنے کو صوفی کہلانا پسند نہیں کرتے۔ وہ اپنے کو شاہدیا اہل حق، اور اپنے طریقے کو طریقت شاہدین یا طریقت اہل حق کہلانا پسند کرتے ہیں۔

حقیقتِ محمدؐ

صلاح الدین ایوبی صاحب شیخ احمد سرہندی صاحب کے مکتوبات دفتر دوم، سے اقتباس نقل کرتے ہیں:

"شیخ مجی الدین ابن عربی اور ان کے پیر و کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات میں ذات ہیں، اسماء و صفات نے اللہ تعالیٰ کے علم میں تمازیز اور تباہی پیدا کیا۔ اس تمازیز اور تباہی کا پہلا مرتبہ بہ صورت اجمالی ہے۔ یہی تعین اوقل ہے اور اسی کو حقیقتِ محمدؐ یہ کہتے ہیں۔ (علی صاحب الصلوۃ والتحیاۃ) اور پھر تفصیلی صورت میں ہے، اور اسی کو اعیان ثابتہ کہتے ہیں جو کہ حقیقتِ ممکنات ہیں۔"

ایوبی صاحب تبصرہ کرتے ہوئے بجا طور پر کہتے ہیں کہ اس میں پہلے نو افلاطونی فکر ہے اور پھر افلاطونی فکر ہے۔

"یہ حضرات کہتے ہیں: خارج میں اعیان ثابتہ کا عکس ظاہر ہوا اور وہ عکسِ ممکنات کا وجود ہے۔ چونکہ عکس اور سایہ ایک خیالی اور موهومی شے ہے، اس لئے ممکنات کا وجود تمثیلی اور موهومی ہوا، حقیقت میں کچھ نہیں۔ چونکہ یہ تمثیلی اور موهومی عکس اللہ تعالیٰ کی صنعت اور کارگری ہے، اس لئے اس کے واسطے کمال اتفاق اور پائیداری ہے۔ وہ مٹ نہیں سکتا۔" اس نظریہ پر شیخ اکبر مجی الدین کے شارح شیخ تاجی کا تبصرہ اس طرح نقل کیا گیا ہے: "حقیقتِ محمدؐ، فلسفہ نو افلاطونیہ میں عقل اوقل کے مصدقہ ہے اور مسیحی فلسفہ میں حضرت مسیح کے کلمہ اللہ ہونے کے مصدقہ۔"

یونانی اور عیسائی فلسفے میں وحدت الوجود کا مأخذ

سقراط کا شاگرد، ارسطو کا استاد، عظیم یونانی فلسفی افلاطون کائنات کے وجود میں آنے کی فلسفیانہ توجیہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کے لئے ایک خالق خدا، اور ایک غیر زمانی غیر مکانی عالم امثال (non-spatio non-temporal world of ideas) کا ہونا بھی لازم ہے جس میں ہر شے، خیال،

احساس، ربط، نسبت، کیت، کیفیت، صفت وغیرہ کے مقابل امثال (مثاںی تصورات، مجرداً ازی نمونے، سانچے یا ہیو لے ideas) موجود ہوں جنکے نمونے یا نقش پر اشیائے کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔ افلاطون نے استدلال کیا کہ کائنات کے وجود پذیر ہونے کیلئے ضروری ہے کہ ایسے مادے کے تصور کو بھی مانا جائے، جو ازال سے خدا کے ساتھ موجود ہوا اور جس پر خدا ان امثال کے عکس ثابت کر سکے۔ چنانچہ مادہ یا عدم محض بھی ہمیشہ سے خدا کے ساتھ موجود ہے۔ مادے کی اپنی مطلقاً کوئی صفت نہیں سوائے امثال کا عکس قبول کرنے کی امیت کے۔ افلاطون کے فلسفے میں، مادہ ان تصورات کے عکس کو قبول کرنے کی استعداد کا نام ہے۔ اس نے مزید استدلال کیا کہ ایک روح کائنات جو دھری فطرت (dual nature) کی مالک ہوا، بیک وقت عالم امثال اور مادی دنیا سے تعلق رکھتی ہو، کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ان امثال کی حقیقت کیا ہے، ان کا خالق خدا سے تعلق کیا ہے، افلاطون نے اس پر اپنا موقف واضح طور پر بیان نہیں کیا۔ افلاطون کے بعد فاسٹہ افلاطون کے شارحین امثال کی نوعیت کے مسئلے پر دو مکاتب فکر میں تقسیم ہو گئے۔

ایک کتب فکر نے کہا کہ افلاطون کے نزدیک یہ امثال، خدا کے ذہن میں پائے جانے والے ازی تصورات ہیں، جنہیں خدا نے اپنے ذہن میں ازال سے ہی تخلیق کیا ہے۔ بعض نے کہا افلاطون کے نزدیک جس طرح خدا ہمیشہ سے ہے، یہ بھی خدا کے ساتھ، خدا کے ذہن میں، ہمیشہ سے موجود ہیں۔ اس تشریح کو امثال کی اندر ون ذات باری تشریح (Intradeical interpretation of Platonic Ideas) کا نام دیا جاتا ہے۔

دوسرے مکتب فکر نے کہا کہ خدا امثال کا خالق نہیں، نہ یہ خدا کے ذہن میں پائے جاتے ہیں۔ عالم امثال، بیرون ذات باری (extraideical) خدا کے متوازی ازال سے موجود ہے، جس میں 'امثال' ایک مراتبی نظام کی صورت منظم ہیں۔ خدا کے ایک طرف عالم امثال ہے اور دوسری طرف مادہ۔ خدا ان تصورات کے عکوس مادے پر ثابت کرتا ہے تو اشیاء وجود میں آتی ہیں۔ جسے مذہب تخلیق کائنات کا نام دیتا ہے، یہ اسکی فلسفیانہ توجیہ ہے جو افلاطون نے کی۔ کائنات کی ہر شے انہیں تصورات میں سے کسی کی مہم نقل ہے۔ ہر تصور اپنی نوع (kind, specie) کا کامل تصور ہوتا ہے، اشیا اسکی ناقص نقل ہوتی ہیں۔

(تاریخ فلسفہ یونان، 122)

امثال کا 'اندر ون ذات باری' (intradeical) ہونا، خدا کے متوازی ایک ازی بے صفت مادے (primordial matter) یا عدم محض (absolute nothingness) کا تصور، ان امثال کے عکس پر اشیائے کائنات کا ظہور، کائنات کے وجود میں آنے کی وہ تشریح ہے جس نے، دین کو فلسفے کے منج پر استوار کرنے کے خواہشمند مذہبی فلسفیوں اور اپنے کشف و شہود کی بناء پر مذہبی فلسفہ تخلیل دینے کے خواہشمند وحدت الوجودی صوفیاء کو ہر زمانے میں شدید متأثر کیا ہے۔ فلو (Philo)، افلاطون سے تقریباً تین سو سال بعد، پہلی صدی عیسوی کا ایک یہودی سکالر ہے جس نے امثال اور خدا کے تعلق کی ان دو تشریحات کو تطبیق دیکری یہودی مذہب کی عقلی تخلیل کی۔ یہ معلوم تاریخ میں فلسفیانہ تخلیل مذہب (reconstruction of religious thought) کا باñی ہے۔ بعد میں عیسائیوں نے اس سے متاثر ہو کر عیسائیت کی عقلی تخلیل کیلئے یہی اندراز اپنایا اور اس طرح مشیش کا نظریہ وجود میں آیا۔ (HAW6149) (کمالی، مائیت خود آگہی اور خودی کی تخلیل 1963) اپنے زمانے میں مسلمان بھی اس سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کے وحدت الوجودی تصور خدا پر اس کے گھرے اثرات ہیں۔ ان وحدت الوجودی صوفیاء اور فلسفیوں نے فلسفہ افلاطون کے 'امثال' (ideas) کیلئے 'اعیان ثابتہ' کی اصطلاح استعمال کی۔ اس طرح افلاطون کا 'اعیان ثابتہ' کا تصور مسلم وحدت الوجودی فلسفے اور تصوف کا حصہ بن گیا۔ ان صوفیاء نے اپنے کشف و شہود کے ذریعے عالم امثال اور اعیان ثابتہ کی تصدیق کا دعویٰ کیا۔ کسی بھی زمانے کے فلسفیانہ اصطلاحات میں منطقی تخلیل کر کے انھیں عقلیت کے راجح الوقت عقلی معیار سمجھا جانے لگتا ہے۔ ہر مذہب کے علماء اپنے مذہبی عقائد اور تعلیمات کی فلسفیانہ اصطلاحات میں منطقی تخلیل کر کے انھیں عقلیت کے راجح الوقت معیار (standard of rationality) کے مطابق ثابت کرنے میں بڑی کشش محسوس کرتے ہیں۔ تاریخ فلسفہ مذہب کے مطابق یہودی مذہبی سکالر فلو (Philo) سب سے پہلا شخص ہے جس نے مذہبی فلسفہ کی بنیاد رکھی۔ فلو کے زمانے میں افلاطون اور ارسطو کے فلسفیانہ نظام معیار عقل کا درجہ رکھتے تھے اور سائنس ایک الگ ضابطہ علم کی حیثیت سے ابھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ فلو، افلاطون سے بہت زیادہ متأثر تھا۔

فلونے یہ ثابت کرنے کیلئے کہ یہودیت کا تصور خدا اور تخلیق کائنات کے عقائد افلاطون کے خدا اور تکوین کائنات کے نظریات سے ہم آہنگ ہیں جنہیں تین سو سال پہلے افلاطون نے خاص فلسفیانہ استدلال سے دریافت کیا تھا، یہودیت کے ان عقائد کو فلسفہ افلاطون کی اصطلاحات میں، منطقی نظام فکر کی صورت میں پیش کیا۔

تاریخ فلسفہ میں سب سے فلو نے یہودیت کی تعلیمات کو افلاطون کے فلسفے سے ہم آہنگ ثابت کرنے کی کوشش میں خدا اور امثال کے آپس میں تعلق کی دو ظاہر متفاہ تشریحات کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے استدلال کیا کہ امثال / اعیان ثابتہ درون ذات باری تھے۔ (Wolfson)

(1961) خدا کے ذہن کے لئے فلولوگوس (عقل / ذهن Logos) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ خدا نے پہلے مرحلے پر امثال سے ایک عالم معقول یعنی کائنات کا عقلی خاکہ (intelligible world) تیار کیا اور اسے لوگوس کے اندر رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے لوگوس کو اپنے سے الگ، ایک محسوس صورت (visible Form / physical form) میں تخلیق کیا۔ یہ لوگوس کی بیرون ذات باری (extraeical) سطح تھی۔ مطلق تصورات جو لوگوس کے اندر رکھے گئے تھے اس طرح ان کا بھی خارجی اشیاء میں ظہور ہوا۔ اعیان ثابتہ کے محسوس صورت اختیار کرنے سے کائنات وجود پذیر ہوئی۔ فلو نے استدال کیا کہ یہودی مذہبی عقائد اور افلاطون کا نظریہ امثال اور نظریہ تخلیق آپس میں ہم آہنگ ہیں، لہذا یہودیت کے عقائد معيار عقل کے عین مطابق ہیں۔

(Wolfson 1961, 31-32)

عیسائی مذہب کی عقلی تشكیل

فلو، سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہمحصر تھا، اگرچہ دونوں مکافی اعتبار سے مختلف مقامات پر تھے۔ جب عیسائیت کو فروغ حاصل ہوا، اور فلو کا تشكیل کردہ یہودیت کا عقلی ماذل عیسائی علماء تک پہنچا تو وہ اس سے بہت متاثر ہوئے اور اسی نسب پر عیسائیت کی عقلی تشكیل میں لگ گئے۔ فلو نے جس تصور کے لئے لوگوس کا لفظ استعمال کیا تھا، عیسائیوں نے اس کی جگہ کراست کا لفظ استعمال کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ کراست (عیسیٰ علیہ السلام) ہمیشہ سے خدا کے ساتھ موجود تھا۔ فلو نے کہا تھا کہ خدا نے لوگوس کو معقول صورت (Intelligible Form) دی اور دیگر تمام تصورات کو اس کے اندر رکھ دیا، عیسائی متكلمین نے کہا کہ کراست جو ازال سے خدا کے ساتھ تھا، (لہذا خدا تھا) خدا نے اسے معقول و مدرک کراست کی صورت دی اور ازالی تصورات کو اس کے اندر رکھ دیا۔ فلو نے کہا کہ خدا کے خدا کے مدرک لوگوس (Intelligible Logos) کو محسوس لوگوس (physical logos) کی صورت میں تخلیق کیا، عیسائی متكلمین نے کہا کہ خدا نے مدرک کراست کو محسوس کراست کی صورت میں تخلیق کیا۔ ازلی تصورات (اعیان ثابتہ) جو کراست کے اندر تھے، وہ بھی ساتھ ہی محسوس صورت اختیار کر گئے اور کائنات وجود پذیر ہوئی۔ کراست روح کائنات ہے۔ عیسائیوں میں اس عقیدے کے کو روان حاصل ہوا کہ عیسیٰ ہمیشہ سے خدا کے ساتھ تھے اس لیے وہ خدا تھے۔ اس طور کے فلسفے میں انہیں ایک اصول نظر آیا جس میں اس نے کہا تھا کہ ہر شے اپنی نوع کے فرد کو جنم دیتی ہے، (Wolfson 1961, 42) عیسائیوں نے کہا کہ کراست خدا کے ساتھ تھا، خدا نے اس کو انسانی شکل میں بھیجا، لہذا وہ خدا کا بیٹا ہے۔ اس طرح عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہنے کی فلسفیانہ تشریع مہیا کی گئی۔ وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ عیسیٰ خدا کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے وجود احتمال ہونے کے باوجود خدا سے الگ بھی نہیں تھے۔ عیسائیت میں ابتدائی دور سے روح القدس (holy spirit/holy ghost) کا ایک تصور بھی چلا آرہا تھا۔ اگرچہ ابتداء میں یہ واضح نہیں تھا کہ روح القدس اور کراست ایک ہی ہیں یا الگ الگ۔ چوتھی صدی عیسوی میں عیسائی متكلمین میں بالآخر یہ طے کر لیا گیا کہ روح القدس، کراست سے الگ حقیقت ہے اور ازل سے خدا کے ساتھ ہے۔ اس طرح خدا (باپ)، کراست (بیٹا) اور روح القدس پر مشتمل الوجہیت کا وہ تصور پیدا ہوا جو عیسائی نظریہ تینیت (trinity) کے نام سے مروج عقیدہ ہے۔ (Wolfson 1961, 42-43)

مسلمان بھی اپنی الہیات، فلسفہ اور روحانیت پر افلاطون کے نظریہ امثال کی اس تشریع کے اثرات کا، جسے ”درون ذات باری تعبیر“ کا نام دیا جاتا ہے، پڑے انکار کریں (کمالی ماہیت خود آگئی اور خودی کی تشكیل 1963) لیکن ہماری دانست میں مسلم فلسفہ و کلام اور روحانیت پر اس کے جو بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں، ان میں سے ایک حقیقتِ محمدیہ کے نظریہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔

فلو نے لوگوس کی صورت میں ایک ایسا تصور پیش کیا جو دو ہری فطرت (dual nature) کا حامل تھا۔ ایک طرف وہ ہمیشہ سے خدا کے ساتھ ہونے کے اعتبار سے خدا تھا اور درون ذات باری تھا، تو دوسری طرف خدا سے الگ پہلے معقول اور پھر محسوس صورت اختیار کرنے کے اعتبار سے مخلوق بھی تھا۔ ذہن خداوندی کے اندر ہونے کے اعتبار سے اعیان ثابتہ بھی الوہی فطرت کے حامل ہوئے۔ لوگوس کے طبعی صورت اختیار کرنے سے، لوگوس، روح کائنات کی حیثیت اختیار کر گیا اور اعیان ثابتہ، اس کے اندر، اشیائے کائنات کی صورت میں ظہور پذیر ہو گئے۔ کائنات کی ہر شے اپنی اصل کے اعتبار سے ذات باری ہی کا اظہار قرار پاتی ہے۔ وحدت الوجود اس کے علاوہ اور کیا ہے۔ عیسائیت نے لوگوس کی جگہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رکھ دیا۔ وہ بیک وقت خدا بھی تھے اور خدا سے الگ طور پر حقیقت بھی۔ وہ اشیائے کائنات کے اندر روح کائنات بھی تھے اور خدا کے بیٹے کے طور پر عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں ظاہر بھی ہوئے۔ پہلا نظریہ لوگوس پر مرکز تھا، بعض اسے حقیقت موسوی کا نام بھی دیتے ہیں۔ یہ وحدت الوجود سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات اقدس کے گرد تشكیل کیا گیا ہے۔ عیسائی مذہبی فلسفی، فلسفیانہ استدال سے، اور عیسائی صوفی اپنے مشاہدات میں اس کی تصدیق کے دعوے دار ہیں۔

یونانی فلسفے کی کتابوں کے تراجم، یہودی اور عیسائی فلسفیوں اور صوفیوں کے نظریات نے مسلمانوں کو بھی ویسے ہی متأثر کیا جیسے فلو کے نظریات نے عیسائیوں کو کیا تھا۔ مسلمانوں نے عیسائیت کی فلسفیانہ تشكیل عیسائیت میں سے کرائست (سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی جگہ حضور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے اسم گرامی کو رکھ دیا اور حقیقت محمد یہ کے تصور کی صورت میں آپ ﷺ کی ذات اقدس کو اللہ کی الوہیت میں بھی شریک کر دیا، ازی بھی بنادیا، ذاتی حیثیت میں حقیقی بھی قرار دیا؛ روح کائنات بھی بنادیا۔ "احد" میں کے پردے میں خود ہی "امحمد" بن کر آگیا۔ "یا" "احد" اور "امحمد" میں بس ویا ہی فرق ہے جیسا کی "ع" اور "غ" میں ہوتا ہے جیسی تلمیحات وضع کر کے اللہ کا اوتار بھی بنادیا۔ اسی طرح مسلمان وحدت الوجودی صوفیاء نے اپنے کشف و شہود میں عالم امثال کا بھی اثبات کیا اور اعیان ثابتہ کا بھی۔ یہودیت کی فلسفیانہ تشكیل مذہب (reconstruction of Jewish religious thought) میں سب سے پہلی چیز جس کا خدا سے ظہور ہوا، وہ لوگوں تھا۔ عیسائیوں کی فلسفیانہ تشكیل مذہب میں وہ سب سے پہلی ہستی حقیقت کرائست، مسلمانوں کی فلسفیانہ تشكیل مذہب وہ حقیقت محمد یہ تھی۔ یہودیوں کے یہاں لوگوں کے اور عیسائیوں کے یہاں کرائست کے محسوس صورت اختیار کرنے سے تمام اعیان ثابتہ کے عکوس مادی صورت میں ظہور پذیر ہو گئے۔ مسلمان صوفیاء کے ہاں دیگر تمزلاں کا ظہور "تعین اقل" یعنی "حقیقت محمد یہ" سے ہوا۔ مسلمان فلسفیوں (الفارابی اور ابن سینا) نے خدا کا دراک عقل مطلق کے طور پر کیا اور "حقیقت محمد یہ" کے مقابل "عقل اقل" کی اصطلاح اختیار کی اور دعویٰ کیا کہ خدا سے سب سے پہلا تعین "عقل اقل" کی صورت میں صادر ہوا جسے صوفیاء نے "حقیقت محمد یہ" کا نام دیا تھا۔ اپنے ظہور کیلئے خدا پر منحصر ہونے کی بناء پر "عقل اقل" مفظی اعتبار سے خدا سے مؤخر (posterior) ہے لیکن زمانی اعتبار سے دونوں ہموقت (simultaneous) یعنی ازلی / قدیم ہیں۔ اپنی فلسفہ آرائی کو تقدس کا درجہ دینے کیلئے روایات بھی گھڑی گئیں۔

فلسفہ افلاطون کے ایک صوفی منش شارح، فلاطینوس نے ارسطو کے استدلال کے زیر اثر خدا کے صاحب ارادہ ہونے کا انکار کرتے ہوئے، ارادی تجھیق کائنات کے بجائے خدا سے کائنات کے اس طرح صادر ہونے کا نظریہ پیش کیا جیسے سورج سے انتقام فطرت کے تحت، شعاعیں صادر ہوتی ہیں۔ مسلم فلسفی الفارابی اور ابن سینا اس سے بہت متأثر ہوئے، اس نظریے کو قبول کیا تاہم بعض ممکنہ اعتراضات کے پیش نظر مرحلہ وار صدور (graded emanation) کا نظریہ پیش کیا جس میں کائنات خدا سے دسویں مرحلے پر وجود میں آتی ہے۔ افلاطون کے شاگرد ارسطو کی طبیعت کے زیر اثر بطليموس (ٹالی) نے نو آسمانی کروں یا افلاک پر مشتمل کائنات کا ایک سائنسی ماذل پیش کیا۔ اس کائناتی ماذل میں چاند، سورج، زہرہ، مرخ اور اس دور کے معلوم ستارے مختلف افلاک پر ظاہر کئے گئے تھے۔ یہ اپنے زمانے کا سائنسی نظریہ کائنات تھا، جو تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال راجح رہا۔ بالآخر ستر ہوئیں صدی عیسوی میں نیوٹن کے میکانیکی نظریہ کائنات نے اس کی جگہ لی۔ مسلم فلسفہ، وحدت الوجودی تصوف، علم الكلام، حدیث، حقیقت محمد یہ کے نظریے اور بہت سے دیگر تصورات پر فلو، فلاطینوس (ان دونوں کے نظریے کو نو فلاطینیت Neo-Platonism کا نام دیا جاتا ہے)، ارسطو اور بطليموس (ٹالی) Ptolemy کے گھرے اثرات ہیں۔ افلاطون کے نہایت ذہین شاگرد ارسطو نے، افلاطون کے بعد، اپنی فکری پیشگوئی کے زمانے میں یہ کہتے ہوئے، کہ افلاطون مجھے بہت عزیز ہے مگر صداقت عزیز تر ہے، فلسفیانہ تقدیم کی بناء پر افلاطون کے عالم امثال اور اعیان ثابتہ کے نظریہ کو ماننے سے انکار کر دیا، لیکن ہمارے وحدت الوجودی صوفیاء اور حکماء آج بھی اپنے کشف و شہود کی تاویل میں ان کا اثبات کرنے پر مصر ہیں۔

ہر نظریہ کسی نہ کسی علمی مسئلہ کے حل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ مسئلہ جس کے حل کے طور پر وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا گیا، ربط الحادث بالقدیم "کھلاتا ہے۔" "القدیم" سے مراد خدا اور "الحادث" سے مراد "ما سوا" ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ بظاہر بڑا جائز (genuine) علمی مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقتاً وہ ایک نام نہاد (pseudo) مسئلہ ہوتا ہے۔ فلسفی اور علماء صدیوں اس پر اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرتے رہے ہوتے ہیں، لیکن سوائے لاحاص مباحث اور ناقابل عبور تفرقة کے اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ مسئلہ ہی جیسی نہیں ہوتا۔ مسئلہ کی تشكیل (formulation) ہی درست اصطلاحات میں نہیں ہوئی ہوتی۔ اس کے پیش فرضیے (presuppositions) ہی نادرست ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنی کتابوں میں مسلم الہیات، فلسفہ، تصوف، اصول تفسیر سے متعلق ایسے بہت سے نام نہاد مسائل کا جائزہ لیکر دکھایا ہے جو اصطلاحات کے غلط انتخاب، اور نادرست مفروضوں کے اطلاق کی پیداوار ہیں۔ ربط الحادث بالقدیم اجس پر حضرت ابن عربی اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے حوالے سے گفتگو کی جائے گی، ہمارے نزدیک ایسا ہی مسئلہ ہے۔ ابو الحسن علوی صاحب کے ایک مضمون "نظریہ وحدت الوجود اور ڈاکٹر اسرار احمد" (محدث فورم آن لائنز، اپریل 2012، 26, 2012) میں "وحدت الوجود" کے نظریہ پر شیخ محبی الدین ابن عربی، اور ڈاکٹر اسرار احمد کے نظریات کا بہت اچھا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ ابن عربی اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے وحدت الوجود پر نکات اسی مضمون سے لئے گئے ہیں۔

اصطلاحات کے غلط اختیاب سے کیا مراد ہے؟ دینی موضوعات پر کام کرنے والوں کو اس بات کا بہت دھیان رکھنا چاہئے کہ کوئی اصطلاح نیوٹرل نہیں ہوتی۔ جس نظام فکر سے آپ کوئی اصطلاح قبول کرتے ہیں اسکی قرآن پاک سے تناقض با بعد الطیعت یعنی بنیادی مفروضے، اس کی پشت پر سوار ہوتے ہیں۔ جب ایسی اصطلاحات کو قرآنی نظام فکر میں قبول کر لیا جاتا ہے، تو یہ مفروضے اس بحث میں داخل ہو کر الجھاؤ اور لا یخل مسائل پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ بعض اوقات صدیاں گزر جاتی ہیں تب جا کر کہیں کسی کو ان اصطلاحات کے نادرست ہونے کا احساس ہوتا ہے، اور انہیں صحیح تناظر میں تشكیل دینے کا خیال آتا ہے۔ زیر بحث مسئلہ کی تشكیل میں اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کی جانے والی اصطلاح 'القدیم' قطعاً قرآن پاک سے تناقض ہے۔

ازلیت یا قدم (eternity) آنات اور لمحات میں تقسیم پذیر زمان کے مؤثرہ ما پسی اس تصور کیلئے بولا جاتا ہے جس کا کوئی خصوص آغاز متصور نہ ہو۔ ابد اصطلاح (unending duration; everlastingness) اسی زمان کی نا اختتام پذیری یا سرمدیت کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ 'حادث' فلسفیانہ اصطلاح (accident / contingent) کا عربی مترادف ہے۔ ہر واقعہ یا شےء جس کا با اعتبار زمانہ آغاز و انجام ہونا متصور ہو حادث ہے۔ لفظ 'قدم' / 'ازلی' فلسفیانہ اصطلاح (eternal) کا مترادف ہے۔ جسے عیسائیوں نے یونانیوں سے اخذ کر کے صفات باری میں شامل کیا۔ (عبد القادر 1994، 239) عیسائیت کی اپنی مذہبی تعلیمات میں یہ تصور موجود نہیں تھا۔ (Swinburne 1977، 217) عیسائیت سے یہ تصور مسلم فکر میں داخل ہوا۔ متعقولہ اور اشاعرہ نے دیگر اصطلاحات کی طرح یہ اصطلاح بھی بلا ادنیٰ تأمل قبول کر لی اور مسلم فلسفے میں 'قدم' کا لفظ اللہ اور کلام اللہ کی صفت کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ روایت مسلم علماء، مفسرین، محدثین اور فلسفہ اور وحدت الوجودی صوفیاء کے ہاں اللہ تعالیٰ کیلئے آج تک یہ اصطلاح مستعمل ہے۔

عیسائی الہیات میں ازلیت / 'قدم' (eternity) کے تصور کو دو انداز میں سمجھا گیا:

(1) زمانی تسلسل کی مؤثرہ ما پسی لامحدودیت یا سرمدیت (everlastingness)۔ سرمدیت اپنی ماہیت میں زمان طبیعی (serial time) ہے جسے ہم ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کر کے متصور کرتے ہیں۔ اسے اگر آغاز کی سمت لامحدود (without beginning) دیکھا جائے تو یہ ازلیت ہے اور انجام کے اعتبار سے غیر مختتم (unending) دیکھا جائے تو یہ ابدیت ہے۔

(2) زمان سے ماورائیت (timelessness)۔ (Pike 1970, ix-x) پیاری کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے شخص کی مثال دی جاتی ہے جو اسکے سامنے ہے اسے بھی اسی طرح دیکھتا ہو جیسے جو اس کے پیچھے ہے۔

کیا قرآن پاک کے خدا کو 'قدم' کے درج بالا دو تصورات میں سے کسی بھی معنی میں لیا جاسکتا ہے۔ ہرگز نہیں! یہ دونوں تصورات قرآن پاک کے تصور اللہ سے صریحاً متناقض ہیں۔ وحدت الوجودی مکتب فکر کا سریانیت اور ماورائیت کا تصور، قدم کے ان دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔

قرآن پاک، اللہ تعالیٰ کیلئے 'قدم' یا 'ازلی' کا لفظ استعمال ہی نہیں کرتا۔ ۱۱ زمان کی مؤثرہ ما پسی لامحدودیت کے معنی میں اور نہ ہی سرمدیت کے معنی میں۔ 'ا بد' کا لفظ بھی قرآن پاک میں انسانوں کے حوالے سے استعمال ہوا ہے۔ بعض لوگ زمانِ الہی کو انسانی زمان سے میز کرنے کیلئے 'بدی حال' (eternal now; pure duration) کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس میں لامحدود ما پسی بھی موجود ہوتا ہے اور نہ مختتم پذیر مستقبل بھی اپنے لامحدود امکانات کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ بعض لوگ اللہ اور زمانے میں عینیت قائم کرتے ہوئے اللہ کو زمانے کو اللہ قرار دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں اس عینیت کیلئے قطعاً کوئی بنیاد موجود نہیں۔ بعض لوگ اللہ کے علم کو 'لکی' (یونیورس) کے مفہوم میں ازلي یا قدمی قرار دیتے ہیں۔ یہ نظریہ اللہ کیلئے ہمیشہ سے ہر شے کے علم کا اثبات کر کے، حال پر خدا کے علم جزئیات، اور انسان کیلئے اخلاقی آزادی سے انکار پر مشتمل ہوتا ہے۔ مسئلہ تقدیر کے موضوع پر، ازلیت، قدم اور علمِ الہی کے اس تصور پر استوار بہت سی وضعي روایات ذخیرہ احادیث میں اس طرح شامل ہو چکی ہیں کہ انہیں ہی اصل اسلامی تعلیمات سمجھ لیا گیا ہے۔ قرآن پاک سے اللہ تعالیٰ کیلئے ماورائیت زمانی (timelessness) کے معنی میں بھی ازلي / قدم کا لفظ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ ماورائیت زمان کا تصور خدا کیلئے مستقبل کو بھی دیے ہی یقین قرار دیتا ہے جیسے حال اور ما پسی کو۔ پیاری کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے شخص کی مثال دی جاتی ہے کہ جو اسکے سامنے ہے اسے بھی وہ اسی طرح دیکھتا ہے جیسے جو اس کے پیچھے ہے۔ چوٹی پر بیٹھے ہوئے شخص کو ما پسی پر قدرت ہوتی ہے نہ مستقبل پر۔ وہ تو ایک ہمیشہ سے بنی بنائی کائنات کو صرف دیکھ ہی سکتا ہے۔ زمانے کا یہ تصور بھی اللہ کی شان کے لائق نہیں۔ یہ خدا کو بھی جبریت میں اس طرح جکڑ لیتا ہے کہ اب اللہ بھی کچھ کر نہیں سکتا، جو کچھ اس سے ہونا تھا وہ ہمیشہ پہلے، جس کا کوئی متعین آغاز نہیں، از خود ہو چکا۔

خدا کے بارے قرآن کا تصور یہ ہے کہ "کوئی شی اسکی مثل نہیں۔" شےء کی حقیقت تعین ہے۔ جو زمان، مکان اور دیگر تمام تعینات کا خالق ہے، خود اسکا تعینات کے ساتھ کسی بھی مماثلت سے پاک ہونا لازم ہے۔ اسلئے وہ کیتا (Supremely Unique) ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے: "اور کوئی آدمی اللہ

کے بارے میں ایسے ہی جھگڑتا ہے، بغیر علم کے، بدایت کے، اور کتاب منیر کے۔ ”(الج ۲۲: ۸) فرمانِ الہی پر عمل کے بعد بات کرنا، علم سے بات کرنا ہے۔ ہادی کے اتباع کا حاصل ہدایت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات، اسماء اور عقائد پر قرآن پاک کی سند سے بات کرنا، کتابِ منیر کے حوالے سے بات کرنا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے: وَلَّهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٧﴾ ”اللہ کو اسکے اسماء الحسنی ہی سے پکارو اور انہیں چھوڑ دوجو اسکے اسماء میں الحاد کرتے ہیں۔ وہ جلد ہی اپنے کئے کی جزا پا سکیں گے۔“ (الاعراف: ۷)

(180)

‘قدم’ اور ‘حدث’ کے درج بالا تصورات افلاطون اور ارسطو کے فلسفوں اور ان کے نو افلاطونی شارحین (فلو اور فلاطینوس) سے اخذ ہوتے ہیں۔ افلاطون کے فلسفے میں خدا، اور اعیان ثابتہ، اور مادہ قدمیم ہیں۔ زمانی و مکانی کائنات بحیثیت مجموعی قدمیم ہے لیکن، کائنات کی ہر ہر شے حادث ہے۔ قدمیم اور حادث میں ربط کا واسطہ ’روح کائنات‘ ہے جو شتوتی نظرت کی حامل ہے اور عقل اس کی صفت ہے۔ ارسطو کے فلسفے میں خدا (خاص صورت) اور مادہ دونوں حقیقی ہیں، ایک دوسرے کے متوالی قدمیم ہیں۔ کائنات کی ہر شے حادث ہے، لیکن کائنات بحیثیت مجموعی قدمیم ہے۔ فلو کے فلسفے میں خدا قدمیم ہے، اشیائے کائنات حادث ہیں، اول لوگوس (Logos) دہری نظرت کا حامل اور بربط الحادث بالقدمیم کا واسطہ ہے۔ مذہب عیسائیت کی فلسفیانہ تشكیل میں خدا، کراست اور روح القدس قدمیم ہیں، اشیائے کائنات حادث ہیں، کراست روح کائنات ہونے کی بحیثیت سے دہری فطرت کا مالک ہے اور قدمیم اور حادث میں رابطہ ہے۔ فلاطینوس (Plotinus) کے نظام فکر میں خدا کے کمال مطلق سے کائنات کا خود بخود صدور (emanation) ہو جاتا ہے جیسے سورج سے شعاعیں۔ صدور ازی ہے، اس لئے خدا بھی قدمیم ہے اور کائنات بھی قدمیم۔ خدا بیٹھ ہے صدور کا، کائنات کا ظہور اس پر منحصر۔ خدا اتنا عظیم الشان اور کمال مطلق کا حامل ہے کہ کوئی نام اس قابل نہیں کہ جس سے اسے موسم کیا جائے۔ افلاطون اور بالخصوص ارسطو کا خدا صاحب ارادہ نہیں۔ ان کے نزدیک صاحب ارادہ ہونا خدا کے کمال مطلق کے منانی ہے۔ افلاطون اور بالخصوص ارسطو کے نظام فکر میں ایک ازی مادہ (primordial matter) خدا کے متوالی موجود تھا۔ یونانی فلسفیوں افلاطون اور ارسطو، نو افلاطونی فلسفیوں کے خدا، مادہ اور لوگوس (universal reason/mind) (عام امثال، اعیان ثابتہ کے تصورات، فلاطینوس کا نظریہ صدور، فلو اور عیسائیت کی تشكیل مذہب کے نظائر اور ارسطو کی طبیعت سے متاثر ہو کر نو آسمانی گروں پر مشتمل سائنسی نظریہ کائنات پیش کرنے والے بطیموس (Ptolemy) کا ارض مرکزی (geocentric) کائناتی مائل وہ فکری ورثہ تھا جس نے مسلمان فلسفیوں الفارابی اور ابن سینا کے ہاں ’ربط الحادث بالقدمیم‘ کے مسئلہ پر ’اعقول عشرہ‘ اور ’او افلاک‘ کے تصورات پر مشتمل نظریہ صدور کی شکل اختیار کی جس میں ’عقل اول‘ کو اللہ سے ظہور کا ’تعین اول‘ قرار دیا گی۔ اس نظریہ میں خدا سے عقل دہم اور افلاک نہم تک دائرة افلاک (celestial sphere) کی ہر شے اور واقعہ قدمیم / ازی ہے۔ عقل دہم سے وجود میں آنے والی کائنات اور جنس اور انواع (terrestrial sphere) بحیثیت مجموعی قدمیم، اشیاء اور افراد افرادی بحیثیت میں حادث ٹھہر تی ہیں۔ خدا سے تخلیق ارادی نہیں بلکہ صدور کی صورت میں از خود تھی۔

فلسفی عقل کو ذریعہ علم مان کر تلاش صداقت کے سفر پر نکلتے ہیں اور منطقی عقلی استدلال کے نتیجے میں جو ثابت ہو، اسے حقیقی مانتے ہیں۔ ارسطونے اسے ”What is rational is real.“ کے اصول کے طور پر متعارف کرایا۔ صوفیاء، وجدان (intuition) کو عقل سے برتر ذریعہ علم مان کر تلاش حق کے سفر پر نکلتے ہیں۔ کشف و شہود (unveiling) کے حاصل کو حقیقت مانتے ہیں۔ What is revealed in ‘unveiling and intuitive experience’ is real.) عقلی تاویل کے بغیر کشف و شہود علم کا درجہ پا سکتا ہے نہ قابلِ ابلاغ ہوتا ہے۔ چنانچہ کشف و شہود یعنی وجود اپنی تجربے کی عقلی تاویل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ صوفیاء اپنے حاصل تاویل کو صداقت قرار دیتے ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ افلاطون اور ارسطو سے اصطلاحات مستعاری جائیں اور اپنے کشف و شہود کی تاویل ایک فلسفیانہ نظام فکر کے تناظر میں کی جائے۔ فلو، فلاطینوس اور عیسائی صوفیاء کی فلسفیانہ تشكیل مذہب کی صورت میں اس کے نظائر پہلے سے موجود تھے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تاویل کیلئے لغت قرآنی نظام فکر سے مستعاری جائے، اور اپنے کشف و شہود کو قرآنی تناظر میں دیکھا جائے۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ اصطلاحات کبھی نیوٹرل نہیں ہوتیں۔ اصطلاحات، فلسفے سے لیں اور تاویل آپ قرآنی تناظر (perspective) میں کریں، ایسا ہونا ممکن نہیں۔ مسلم وحدت الوجودی متكلمین، فلاسفہ اور صوفیاء سے ایسا ہی ہوا ہے۔ انہوں نے اللہ کیلئے ’قدمیم‘، اپنے نظریے کیلئے ’وحدت الوجود‘، اپنے مسئلے کے لئے ’ربط الحادث بالقدمیم‘، خدا سے ظہور اول کیلئے ’تعین اول‘، انتزولات شے، امرات سبعہ، احضرات خمسہ، اعیان ثابتہ، غیرہ غیرہ غیر قرآنی تناظر سے قبول کردہ اصطلاحات قبول کر کے، من مانی قرآنی تفسیر کے ذریعے، قرآنی تناظر سے مطابقت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ⁱⁱⁱ

مشہور صوفی، شیخ اکبر محبی الدین ابن عربیؒ نے اپنے کشف و شہود کی تاویل میں 'تزلزلات شہ' کے نظر بے کو قدیم سے حادث کے ظہور اور ربط الحادث بالقدیم کی بنیاد بنایا۔ یہ نظریہ وحدت الوجود کھلا تا ہے۔ صوفیاء کے ہاں 'تزلزل' کا لفظ 'ظہور' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض دیگر صوفیاء نے یہی تصور 'مراقب سبعہ' اور 'حضرات خمسہ' کے عنوانات سے بھی پیش کیا ہے۔

ابوالحسن علوی صاحب کے مطابق "ابن عربی کے نزدیک ذات الہی سے پہلا تزلزل 'حقیقت محمدیہ' میں ہوا ہے اور یہ تزلزل اللہ تعالیٰ کی صفت علم میں ہوا ہے۔" مسلم فلسفیوں کے نظریہ صدور میں خدا سے جو تعین اول 'عقل اول' کہلاتا ہے، فلو کے ہاں لوگوس / کلمہ، عیسائیوں میں حقیقت عیسیٰ، اور حضرت ابن عربیؒ کے وحدت الوجودی نظام فکر میں 'حقیقت محمدیہ' کہلاتا ہے۔

دوسرा تزلزل ان کے نزدیک 'حقیقت محمدیہ' سے اعیان ثابتہ میں ہوا ہے۔ اور تیسرا تزلزل 'اعیان ثابتہ' سے 'روح' میں ہوا ہے۔ چوتھا تزلزل 'روح' سے 'مثال' میں اور پانچواں 'مثال' سے 'جسم' میں اور چھٹا 'جسم' سے 'انسان' میں ہوا ہے۔ ابن عربی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو بنانے کا رادہ کیا تو اس کا ایک ابھائی تصور کیا۔ یہ ابھائی تصور وحدت الوجود یوں میں 'حقیقت محمدیہ' کہلاتا ہے۔ "حقیقت محمدیہ" کو صوفیاء کے ہاں 'مرتبہ وحدت' اور 'موجود ابھائی' اور 'حقیقت الحقائق' اور 'عقل اول' اور 'علم صفات' اور 'ظہور اول' اور 'عالم رموز' اور 'امم الفیض' وغیرہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ابن عربی کے نزدیک اس ابھائی تصور اور خیال کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کی جانے والی مخلوق کا تفصیلی تصور کیا۔ اس مقام کا نام ابن عربی کے ہاں 'اعیان ثابتہ' ہے۔ اس مرتبے کو صوفیاء کے ہاں 'مرتبہ واحدیت' اور 'قابلت ظہور' اور 'وجود فاکس' اور 'ظل محدود' وغیرہ جیسی اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اعیان ثابتہ سے شیخ ابن عربی کی مراد آسان لفظوں میں یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ: "خارج میں موجود مخلوقات کے جو ہیوں اللہ کے صفت علم میں موجود ہیں، وہ اعیان ثابتہ ہیں۔"

ان تین مراتب یعنی ذات الہی، 'حقیقت محمدیہ' اور اعیان ثابتہ کو شیخ ابن عربی کے وحدت الوجود میں 'مراقب الہی' کہتے ہیں کیونکہ تزلزل اول اور

تزلزل ثانی کی صورت میں اللہ کا ابھائی علم ہوا اللہ کا تفصیلی علم، وہ اللہ کی صفات عین ذات ہیں۔ پس یہ تینوں اللہ کی ذات ہی

کے مراتب ہیں۔

اعیان ثابتہ کے بارے میں ابن عربی کا یہ نقطہ نظر نہایت اہم ہے: "اعیان ثابتہ نے خارج میں وجود کی بوہی نہیں چکھی یعنی اللہ کے علم میں اعیان ثابتہ کے مطابق 'خارج' میں کوئی مخلوق وجود میں نہیں آتی ہے۔ تیسرا، چوتھے، پانچویں اور چھٹے تزلزل کے بارے میں شیخ ابن عربی کا کہنا ہے کہ یہ در حقیقت اعیان ثابتہ کا عکس اور سایہ ہیں۔ یعنی چوتھے سے چھٹے تک تزلزل اعیان ثابتہ کے عکس و ظلال میں ہوا ہے۔ یہی عکس و ظلال خارجی وجود ہیں۔ انہی عکس و ظلال میں وہ تزلزلات کے چار مرافق بیان کرتے ہیں۔ شیخ ابن عربی کے بیان کردہ تیسرا چوتھے اور پانچویں تزلزل کو 'مراقب کونیہ' کا نام دیا جاتا ہے اور انہیں 'مراقب امکانیہ' بھی کہتے ہیں۔ یعنی ان مراتب کی اشیاء کے وجود کا اگرچہ خارج میں امکان ہے لیکن خارج میں ان اشیاء کا وجود نہیں ہے۔ پس ابن عربی کے نقطہ نظر کے مطابق یہ کائنات اور اس میں موجود ہر شے در حقیقت اللہ کا خیال اور تصور ہے اور اس کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے۔ پس خارج میں سوائے ذات باری تعالیٰ کے کوئی اور وجود نہیں ہے اور اسی کو صوفیاء وحدت الوجود کہتے ہیں۔

شیخ ابن عربی کے ہاں تزلزلات / ظہور کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی صفت علم میں ہوا ہے۔ ابن عربی صفات کی ذات سے عینیت کے قائل ہیں۔ چونکہ صفت علم ذات سے علیحدہ کوئی شے نہیں ہے، لہذا تزلزل در حقیقت ذات میں ہی تمايز علمی کی صورت میں ہوا ہے۔ یعنی ابن العربیؒ کے ہاں اللہ کی 'صفت علم' ظہور کا سمات کی وجہ ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کے بیان میں صفت کا لفظ کہیں استعمال کرنا پسند ہی نہیں کیا۔ فرمان الہی ہے: وَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا وَدَرُّوا لِلَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ سَيِّجُرُونَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١﴾ "اللہ کو اسکے اسماء الحسنی ہی سے پکارو اور انہیں چھوڑ دو جو اسکے اسماء میں الحاد کرتے ہیں۔ وہ جلد ہی اپنے کئے کی جزا پائیں گے۔" (الاعراف: 7-180)

طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر اسکے اسامی الحسنی کے حوالے سے گفتگو کرنا وہ سلیقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے سکھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو قدیم قرار دینے سے اس کی صفات بھی قدیم ٹھہرتی ہیں۔ صفات کے قدیم ٹھہرنے سے بالترتیب تنزلات ستر کے مراحل پر وجود میں آنے والے تمام تعینات، حقیقت محمدیہ، اعیان ثابتہ، روح، مثال، جسم، اور انسان سمجھی نہ صرف قدیم بلکہ ذات باری کا جز ٹھہرتے ہیں۔ درج بالاتعینات کو اگر یونانی، نو فلسطینی اور عیسائی فلسفوں کے ساتھ تقابل کر کے دیکھا جائے تو سوائے اصطلاحات کے کوئی حقیقی اختلاف نہیں۔ جو لوگ حق کے مقابل اپنی پسند کو وقعت دیتے ہیں ان کے بارے میں فرمان الہی ہے: وَجَعْلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكُفُورٌ مُّبِينٌ ﴿٤٣﴾ اور اس کے لئے اس کے بندوں سے ایک جز ٹھہرایا بے شک انسان صریحانہ شکر ہے۔ (سورہ الزخرف: 43: 15) اشیائے کائنات کو اللہ کا جز قرار دینا، بے شک عکوس و ظلال کی صورت میں ہو، قطعاً خلاف حق ہے۔

'ربط الحادث بالقدیم' کے ذیل میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے ہاں تنزلات کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا اور پہلی مرتبہ کلمہ 'کن' کہا تو اس سے کوئی مخلوق پیدا نہیں ہوئی بلکہ کلمہ 'کن' نے ہی ایک نور بسیط کی صورت اختیار کر لی۔ گویا یہ اللہ کی صفت کلام سے ظہور میں آنے والا تعین اقل تھا، جس سے دیگر تعینات وجود میں آئے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے مساوا کے وجود کو حقیقی ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ چونکہ کلمہ 'کن' نے ہی تنزلات کے حوالے سے مساوا کی صورت اختیار کر لی، اسلئے مساوا کے وجود کا اصل منبع اللہ کی ذات ہی ہے۔ یعنی کائنات یا مساوا کی اصل حقیقت وحدت الوجود ہی ہے۔

جناب ابو الحسن علوی صاحب ڈاکٹر اسرار احمد علیہ رحمۃ کے ہاں، حضرت ابن عربیؒ کے اللہ کی صفت علم سے سلسلہ تنزلات شروع ہونے کے مقابل، سلسلہ تنزلات کے اللہ تعالیٰ کی صفت کلام میں شروع ہونے کو، ابن عربیؒ اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے موقف میں جو ہری فرق قرار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک سرے سے یہ کوئی فرق ہے ہی نہیں۔ دونوں اللہ کی کسی صفت ہی کے اثر کو تنزلات کی بنیاد قرار دیتے ہیں، اسلئے ڈاکٹر اسرار احمدؒ پر وہی تقدیم صادق آتی ہے جو حضرت ابن عربیؒ پر آتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ یہ جانے کیلئے کاوش نہیں کر سکے کہ فلسفیوں نے 'قدیم' (ازلی) کی اصطلاح کہاں سے قبول کی ہے، یہ کن مفہوم میں استعمال ہوتی ہے، اور کیا ذات باری کیلئے یہ اصطلاح استعمال کرنا قرآنی ناظر میں درست بھی ہے۔ چنانچہ انہیں اس بات کا ادراک ہی نہیں ہوا کہ یہ مسئلہ خدا کے غیر قرآنی تصور سے تشكیل پذیر ہوا ہے۔

آیے 'حقیقت محمدیہ' کے تصور کو قرآن پاک کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے: وَمَا حَلَقْتُ السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَا عِيْنَ ﴿٣٩﴾ مَا حَلَقْتَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٤﴾ (سورہ الدخان: 38-39) آسمان، زمین اور ان کے مابین کسی چیز کو اللہ نے بے مقصد، محض کھیل تماشے کیلئے تخلیق نہیں کیا۔ ہر شے کو حق کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے۔ اولوں الباب جو کھڑے، بیٹھے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر تھکر کرتے ہیں، وہ پکار رکھتے ہیں: -- رَبَّنَا مَا حَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا -- ﴿١﴾ اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ باطل پیدا نہیں کیا۔ (سورہ آل عمران: 191: 3) جب بے مقصد کوئی شے تخلیق ہو، ہی نہیں سکتی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہی نہیں، تو کائنات کی تخلیق، بحیثیت مجموعی، کیسے بے مقصد ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ خود خواہش، احتیاج، نقص، کمی، عیب، ضعف، قصور سے پاک ہے۔ نہ تخلیق کائنات کا ارادہ ہمیشہ سے تھا، نہ عدم تخلیق کا ارادہ، ہمیشہ سے تھا۔ وہ کائنات کو تخلیق نہ کرتا تو اس کی شان میں کوئی کمی نہ رہتی۔ اس نے کائنات کو تخلیق کر دیا تو اس کی شان میں کوئی اضافہ نہیں ہو گیا۔ اس شان بے نیازی میں اس نے چاہا، کائنات کو تخلیق کر دیا۔ اللہ نے ہر شے کو اپنے ارادے اور امر سے تخلیق کیا ہے۔ کوئی شے از خود بغیر اللہ کے ارادے اور امر کے اس سے صادر (emanate) نہیں ہو گئی۔ اللہ کے امر 'کن' سے عنوان رکھ دیا جاتا ہے، تنانگ اللہ کی حکمت کے مطابق تخلیق ہوتے ہیں۔ قرآن پاک سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا دارالعمل ہے۔ آخرت دارالجزرا ہے۔ اللہ نے دونوں جہان اپنے بندوں کیلئے تخلیق کئے ہیں۔ اس نے کچھ بھی اپنے لئے تخلیق نہیں کیا، سب کچھ اپنے بندوں کیلئے بنایا ہے۔ وہ اپنی ذات سے غنی ہے، مگر بندوں کی بہت پرواہ کرتا ہے۔ یعنی بندے (عبد) باعث تخلیق کائنات ہیں، باعث تکوین کائنات ہیں۔ قرآن پاک سے پتہ چلتا ہے کہ، حضرت محمد الرسول اللہ ﷺ کے عبد ہیں۔ (سورہ الاسراء: 17: 1) یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عباد میں سب سے بڑی شان حضرت محمد ﷺ کی ہے۔ حضرت محمد الرسول اللہ ﷺ مقصود کائنات ہیں۔ دیگر تمام انبیاء کرام اور شاہدین بھی مقصود کائنات ہیں۔ دائرة علم میں مقصد تخلیق پہلے وجود میں آتا ہے، تخلیق بعد میں وجود میں آتی ہے۔ لیکن آپ بھی اللہ کی الوہیت میں قطعاً

شریک نہیں۔ جو لوگ بندوں کو اللہ کا جز ٹھہراتے ہیں وہ شرک کا رہا کاب کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں، فلوکے لوگوس، عیسائیوں کے کراست، ابن عربی کی "حقیقت محمدیہ" یعنی دہری فطرت کی حامل (dual nature) ہست کا، جو الہیت میں ہمیشہ سے شامل ہوا اور مخلوق بھی ہو، کوئی تصور نہیں۔ حضور ﷺ بنی آدم ہیں، عبد ہیں، لیکن نور ہیں۔ نور کی شان یہ ہوتی ہے، کہ اس سے بندے پر اس کا موجود اور مقصود روشن ہوتا ہے۔ مقصود کائنات ﷺ وہ آئینہ ہیں، جس سے بندہ اپنے موجود کے عرفان کے ساتھ، مقصود کی طرف چل پڑتا ہے۔ تمام عالمین کیلئے اللہ کی رحمت کے خزانوں کے مالک بھی ہیں۔ اگر اللہ، جو کیتا ہے، احمد ہے، الصمد ہے، اپنے بندے کو اپنی رحمتوں کی تقسیم کے شرف سے نواز سکتا ہے، تو بندہ اپنے محبین کو اس شرف میں شریک کیوں نہیں کر سکتا۔ مرتبے تقسیم کرنے کیلئے ہوتے ہیں، تقسیم ہو رہے ہیں، اور ہوتے رہیں گے۔ "احلوں" اتحاد، وغیرہ غیر قرآنی تصورات ہیں۔ بندے کا اپنے اللہ سے معاہ (togetherness) کا تعلق ہوتا ہے۔ جس طرح "رحمۃ اللعیمی" کی شان گمان اور قیاس کے احاطے میں نہیں آسکتی، امعیت کی کیفیت بھی گمان اور قیاس کے احاطے میں نہیں آسکتی۔ حضور ﷺ کو اللہ کے ساتھ اکمل معاہ کا تعلق حاصل ہے۔ تفسیر فاضلی میں "حقیقت محمدیہ" کی اصطلاح کہیں استعمال نہیں ہوئی۔ یہ ہے "حقیقت محمدیہ" کے تصور کا مختصر سایبان جو قرآن پاک سے اخذ ہوتا ہے۔ اس تصور کی رو سے حضور ﷺ مقصود کائنات ہونے کے اعتبار سے باعث تکوین کائنات ہیں، عبدیت کا مطلق نمونہ ہونے کے اعتبار سے نور ہیں۔

اس کتاب میں بہت اہم نکات توحید وجودی اور توحید شہودی کے ضمن میں زیر بحث لائے گئے ہیں اور "لغت قرآن" کے حوالے سے قرآنی تناظر میں ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بہت بڑا تحقیقی کام ہے جو بڑی قابلیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس تعارف کا مقصد، اس کتاب کے قارئین پر ایوبی صاحب کے کام کی ایہیت کو آشکار کرنا، مقصد قرآن لغت^۱ کے تصور کو واضح کرنا، اور جس حق کو صلاح الدین ایوبی صاحب نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے اسے مزید روشن کرنا ہے۔ شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، وحدت شاهدین، طریقت شاهدین وغیرہ کے تصورات جس طرح ہم نے بیان کئے ہیں یہ "تفسیر قرآن بالقرآن" کے اصولوں اور مقصد قرآن لغت^۲ کی بنیاد پر قرآنی تصورات کو روشن کرنے کی مثال ہیں۔ صلاح الدین ایوبی صاحب نے جتنی محنت اور قابلیت سے یہ کتاب لکھی ہے، جتنے زیادہ پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے، ان سب پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو کسی اور موقعہ پر ان کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

اتحاد بین المسلمين

آخری لیکن نہایت اہم بات یہ ہے کہ جن بالتوں اور عقائد کو جنہیں جناب صلاح الدین ایوبی صاحب گمراہی سمجھتے ہیں، ان میں سے اکثر کے متعلق ہم ان سے اتفاق کرتے ہیں، اور ان کے اخلاص کے بہت قدر دان ہیں۔ ہر چھوٹا یا بڑا مسلم فرقہ، دوسرے مسلم فرقے کے بعض عقائد اور طریق عمل کو گمراہنا سمجھتا ہے، ان پر کفر اور شرک کے لیبل عائد کرتا ہے۔ مذہبی رسم و عبادات میں شرکت اور سماجی تعلقات بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ فرقہ وارانہ بنیادوں پر مساجد (جو اللہ تعالیٰ کے گھر خانہ کعبہ کی توسعہ ہیں) بنائی جاتی ہیں۔ فرقہ واریت کو قائم رکھنے اور فروع دینے کیلئے مدارس بنائے جاتے ہیں۔ ہر فرقے میں ایسے صاحبان علم موجود ہیں جو امت مسلمة کو تفرقہ سے نکلنے، اور اتحاد بین المسلمين کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔ ہم نے اپنے مضمون میں بیان کیا ہے، کہ قرآن پاک کے اپنے فرمان کے مطابق کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر قرآن پاک میں رہنمائی موجود نہ ہو۔ آئیے دیکھئے ہیں قرآن پاک تفرقہ کے تدارک اور اتحاد بین المسلمين کے فروع کے بارے میں کیا رہنمائی عطا کرتا ہے۔ مضمون کے شروع میں ہم نے سورہ طا کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ جب موئی علیہ السلام اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا جانتشیں بننا کر کوہ طور پر گئے، تو ان کے پیچھے آپ کی قوم کے ایک گروہ نے پچھرے کے بت کو معبد بناللہ واپس آکر آپ نے اپنے بھائی سے سخت باز پرس کی کہ جب آپ نے انہیں گمراہ ہوتے دیکھ لیا تھا تو روا کیوں نہیں:

قالَ يَاهَارُونُ مَا مَنْعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضُلُّوا ﴿۱﴾ "فرمایا اے ہارون! تمھیں کس نے منع کیا تھا، جب تم نے انہیں گمراہ ہوتے

دیکھ لیا تھا۔

﴿أَلَا تَتَعْنِي أَفَعَصَيْتَ أَمْرِي﴾ کہ میرے پیچھے آتے۔ کیا تم نے میرے امر کے خلاف کیا۔" قالَ يَبْلُوُمَ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي ﴿۲﴾ "عرض کی اے میرے ماں جائے: نہ میری داڑھی پکڑیے، نہ سر کے بال۔ بے شک مجھے یہ ڈر تھا کہ آپ فرمائیں گے، کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور تم نے میری بات یاد نہ رکھی۔" (سورہ طا ۲۰: ۸۵-۹۴)

قوم کے اس گروہ نے، جس نے بچھڑے کے بہت کو معبد بنالیا، اللہ کو ماننے سے انکار نہیں کیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کو ماننے سے انکار نہیں کیا تھا۔ سامری نے انہیں کہا تھا۔۔۔ هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُّ مُوسَىٰ فَنَسِيَ ﴿٨٨﴾۔۔۔ کہ یہ ہے تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا معبد، جسے وہ بھول کر کہیں چلے گئے ہیں۔" (سورہ طہ ۲۰: ۸۸) حق سے اخراج گراہی (الضلال) ہے۔ حق سے اخراج کی وجہ سے وہ شدید گراہی کے مر تکب ضرور ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے انہیں کافر یا مشرک نہیں کہلوایا، گراہی کا مر تکب ضرور کہلوایا۔ حضرت ہارون علیہ السلام اگر ان کی گراہی کو دیکھ کر ان سے الگ ہو جاتے، تو حق کو ماننے والے ان کے ساتھ ہو جاتے، باقی پیچھے رہ جاتے۔ تفرقہ واضح ہو جاتا۔ اہل سنت، اہل تشیع، اہل حدیث، اہل دین، بریلوی، وحدت الوجودی، وحدت الشہودی کی مثل فرقہ وارانہ شناختیں وجود میں آجاتیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی امت تفرقہ کا شکار ہو جاتی۔ حضرت ہارون نے موسیٰ علیہ السلام کے حکم کو پیش نظر رکھتے ہوئے، گراہی کو برداشت کر لیا، قوم کے تفرقہ میں مبتلا ہونے کو پسند نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے صریح گراہی میں مبتلا لوگوں پر کفر اور شرک کا لیبل نہیں لگایا۔ تفسیر قرآن کے قرآنی اصولوں اور مقصد قرآن لغت کے مطابق اسکا حاصل یہ بتتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تفرقہ، گراہی سے بڑا جرم ہے۔

اپنے سے مختلف فرقوں کے ذیلی عقائد اور طریق عمل کو نادرست بلکہ گراہ کن سمجھنے کے باوجود، غنیادی عقائد: "اللہ تعالیٰ کی توحید، حضور نبی کریم ﷺ کی مطلق ختم نبوت، قرآن پاک کے المزبور میں اللہ امعیار حق اور آخری کتاب ہدایت ہونے، اور روز جزا" پر ایمان کے دعوے کی بنابر، کفر، شرک اور ارتداد کے لیبل لگانے کو قطعاً خلاف حق جانا چاہئے۔

جس طرح حج اور عمرہ کے موقع پر تمام فرقوں کے مسلمان، اپنے اپنے طریقے اور عقائد کی تفہیم کے مطابق، فریضہ حج یا عمرہ کے ارکان ادا کرتے ہیں۔ کوئی، اللہ کی بارگاہ میں کسی کے اظہار عبدیت اور اللہ کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں اظہار عقیدت و محبت میں مخل ہوتا ہے نہ تحریر اور تبرہ کرتا ہے۔ ہر کوئی اپنی لپنی سمجھ کے مطابق، ایک دوسرے کے لئے اظہار محبت کرتا ہے، آسانی کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح روزمرہ زندگی میں بھی، اجتماعی رسم و عادات میں شرکت اور سماجی تقریبات اور تعلقات میں فرقہ وارانہ رکاوٹوں کو "گراہی سے بڑا جرم تفرقہ" کے قرآنی اصول کے مطابق دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

تفرقہ کے ساتھ مسجدوں اور دینی مدرسوں کی رجسٹریشن، تفرقہ کو قانونی تحفظ دینے والی بات ہے۔ لہذا خلاف حق ہے۔
مسجد اللہ کے گھر ہیں۔ مساجد میں تفرقہ کو پر وموٹ کرنے والی ہر ایکٹوئی خلاف حق ہے۔

مذہبی مدرسوں کو تفرقہ کے فروع کی نرسریاں بننے سے روکنے کا طریقہ یہ ہے، کہ انہیں جدید کالجوں اور جامعات کا، اور اساتذہ کو سرکاری کالجوں کے اساتذہ کا سٹیشن دے دیا جائے، اور ان جامعات میں تمام جدید مضامین میں تعلیم کی سہولت بھی دستیاب ہوئی چاہئے۔ سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اداروں اور جامعات میں بھی تفرقہ کو فروع دینے والی کسی ایکٹوئی کی اجازت قطعاً نہیں ہوئی چاہئے۔ یہ چیزیں اداروں میں میراث کا قتل، حق کے نام پر ایک خاص نقطہ نظر کے تسلط، تلاش حق کی آزادی میں تدغی، اور خوف پیدا کر کے، تغییبی اداروں کو بر باد کرتی ہیں۔

دین میں علمی تحقیق اور تدبیر میں آزادی کا مقصد اپنے عقائد اور طریق عمل کو تضاد سے پاک کرنا اور فرمان الہی کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ اپنے طریقے سے واضح کرنا ہو۔ دین میں علمی تحقیق، تدبیر اور اشاعت کی آزادی کے نام پر تفرقہ پیدا کرنا، یا دوسرے فرقوں کفر اور شرک کا لیبل لگا کر تفرقہ کو پر وموٹ کرنا نہیں ہوئی چاہئے۔

قول کی صورت امعیار حق ہونے کا درجہ صرف قرآن پاک کو حاصل ہے۔ دین کے نام پر ہونے والی ہر تحقیق کو قرآن پاک پر استوار کئے بغیر، تفرقہ کا غائب نہیں۔ تفسیر قرآن کے قرآنی اصولوں کی صورت میں اپنا حاصل تحقیق ہم نے پیش کر دیا ہے۔ "اتحاد بین المسلمين" کے آزو و مندر، تمام فرقوں کے صحابان علم، اس پر تدبیر فرمائیں۔

تمام فرقوں کے صحابان علم پر مشتمل کمیٹی، جن کم سے کم اصولوں پر اتفاق کرے، انہیں ایک مضمون کی صورت میں مدون کر دیا جائے۔ یہی تمام مسلم فرقوں کیلئے اسلامیات کی تمام کلاسوں کا کل نصاب ہو۔ باقی تعلیم وہ اپنے والدین کے ذریعے خود حاصل کریں۔

اس بات کو قومی سطح پر ایک نعروہ بنا دیا جائے کہ "گراہی سے بڑا جرم، تفرقہ"۔

محترم صلاح الدین ایوبی صاحب کا الجھ اگرچہ کہیں ذرا تنخ ہو جاتا ہے، لیکن آپ بنیادی طور پر 'اتحاد میں المسلمین' کے علمبردار اور تفرقة کے خاتمے کے موید ہیں۔ جن نظریات کو یہ درست نہیں سمجھتے، قرآن پاک کی روشنی میں اس کی از سر تو تشكیل کی کوشش کرتے ہیں تاکہ قارئین کو اپنے عقائد پر تدبر میں مدد ملے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں انکی اس کوشش میں شریک ہونے کا شرف بخشنا ہے، ہم صلاح الدین ایوبی صاحب کے بھی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمیں اپنی اس کوشش میں شریک ہونے کا موقع دیا۔

(جنوری 2019)

ڈاکٹر عبدالحفیظ قادری فاضلی

سابق چیئرمین شعبہ فاسفہ، جامعہ پنجاب لاہور۔

امعتزلہ اور اشعارہ متكلمین کے دو گروہ تھے جو مسلمانوں میں ابتدائی صدیوں ہی میں تشكیل پائے۔ ان کے درمیان جو مسائل مابہ المذاع تھے، ان میں سے ایک خلق قرآن کے مسئلہ کے نام سے مشہور ہے۔ معتزلہ اس نظریے کے حامی تھے کہ قرآن پاک ازلی نہیں ہے بلکہ خلق کیا گیا ہے کیونکہ اس میں بہت سے ایسے واقعات کا تذکرہ ہے جن کا نزول قرآن کے زمانے میں یا اس سے پیشتر تخلیق کائنات کے بعد ہوا تھا۔ قرآن پاک کو حادث قرار دینے کے اس نظریے سے احکام قرآن کی دوامیت کو خطرہ لا تھی ہوتا تھا، چنانچہ اشعارہ نے ان کے مقابل قرآن پاک کے ازلی اور غیر مخلوق ہونے کا نظریہ پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی ازلیت میں کسی اور چیز کو شریک کرنا شرک کے مترادف ہو گا، انہوں نے مؤقف یہ اختیار کیا کہ 'قرآن مخلوق کی صورت میں نزول سے پہلے کام اللہ، اللہ کی صفت کلام میں مضر تھا۔ صفت کلام ہمیشہ سے ذات باری کے ساتھ تھے، اسلئے قرآن پاک بھی ازلی ہے۔ الفاظ کی صورت میں اظہار سے پہلے ہن میں پائے جانے والے خیالات کیلئے 'کلام نفسی' اور الفاظ کی صورت میں تشكیل پانے کے بعد کیلئے 'کلام لفظی' کی غیر قرآنی اصطلاحات وضع کرتے ہوئے انہوں نے دعویٰ کیا کہ قرآن پاک 'کلام نفسی' کی صورت میں ہمیشہ سے خدا کے ساتھ تھا، اسلئے یہ ازلی اور غیر مخلوق ہے۔ کیا یہ افتری نہیں ہے۔ کیا یہ اللہ کے فرمان: **وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ أَفْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا** ۔۔۔ ﴿كَذِبًا﴾ کہ اللہ پر افتری نہ باندھو۔ (سورہ ہود 11:18) کی خلاف ورزی نہیں۔ یہاں سے 'الحق'، جو کہ قرآن پاک کا نام ہے، کے اسماء الحسنی میں شامل کئے جانے کی بنیاد رکھی گئی۔ اور یہ اسلامی عقائد کا باقاعدہ حصہ بن گیا۔ اس نظریہ کی پشت پر یونانی فلسفے کے اثرات بھی ہیں، جنہیں یہاں ٹریس کرنا مناسب نہیں۔

انسانوں کی اخلاقی اعمال میں آزادی کے مسئلے پر بھی اس کے نہایت گھرے مقنی اثرات مرتب ہوئے۔ اس عقیدے کو فروغ ہوا کہ ابتدک، جس کی کوئی حد نہیں، ہر چیز جس میں قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے وہ اعمال بھی شامل ہیں جن کی بناء پر انہیں جنت یا جہنم کا حقدار ٹھہرایا جاتا ہے، ازل سے، جس ہمیشہ کی کوئی حد نہیں، علم الہی میں مضر ہیں۔ علم الہی کے اس عقیدے میں علم الہی کے مطلق یعنی مقابل خطا ہونے کا تصور بھی شامل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ سے یہ علم ہے کہ کوئی انسان پیدا کئے جانے کے بعد کیا اخلاقی اعمال سرانجام دے گا، اور کس جزاک سزا اور ٹھہرے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان آزاد کیسے ہے۔ اشعارہ نے بزم خود ایک درمیانی پوزیشن اختیار کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ گواللہ کا علم ازلی ہے، اور ہر شے پر محیط ہے، مقابل خطا بھی ہے، تاہم یہ انسان کے ارادی افعال کو صرف بیان کرتا ہے، معین نہیں کرتا۔ (Knowledge is descriptive but not determinative or causative.) انسان جو بھی کرتے ہیں، اس میں وہ آزاد ہیں۔ ظاہر ہے یہ انسان کی اخلاقی آزادی کا نہایت کمزور نظریہ ہے۔ محض اپنے انجام سے لامركھے جانے سے کیا واقعی آزادی ارادہ کا ثبوت مل جاتا ہے! درج بالا نظریہ، اللہ کو (معاذ اللہ) ایک سکرپٹ رائٹر بنادیتا ہے۔ ابتداء سے انتہا تک ہر چیز اس سکرپٹ میں ازل سے علاماً معین ہو چکی ہے۔ سکرپٹ میں ابد تک کبھی بھی کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ نہ خدا آزاد ہتا ہے اور نہ انسان۔

ہم صدیوں سے جزو قدر کے مسئلہ پر الجھے ہوئے ہیں جو شاخانہ ہے خلق قرآن کے مسئلہ پر قرآن پاک اور اس کے نازل کرنے والے دونوں کو 'الحق' اقرار دیکر قرآن پاک کو اللہ کے اندر مضر قرار دینے کا۔ معتزلہ کا موقف بھی یقیناً قرآن پاک سے متصادم تھا۔ لیکن معتزلہ کے موقف کو رد کرنے کا اشعارہ کا پیش کردہ حل بھی قرآن پاک سے یکساں متصادم تھا جس سے آگے مزید مسائل پیدا ہوئے۔ امّت مسلمہ میں اشعارہ کے نظریات کو فروغ حاصل ہوا، اسلئے یہ نظریات اسی طرح چلے آرہے ہیں اور آج عالمہ جاوید احمد غامدی، ڈاکٹر ذاکر نائک جیسے ظاہر عقليت پندلوج بھی اسی نظریہ کو دھراتے چلے جا رہے ہیں۔

رضاء و رشیت (ارادہ) میں فرق ہے۔ الہامی کتابیں رضائے الہی کے علم پر مشتمل ہوتی ہیں۔ انبیاء کرام بنی نوع انسان کے سامنے رضائے الہی پر عمل کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ انسان، شاہدین کے اتباع میں رضائے علم کے علم پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ رضائے الہی پر عمل کرنے میں انسان آزاد نہ ہو تو اللہ کی بارگاہ میں جواب دی کا تصور قائم نہیں رہتا۔ نتائج پر اللہ کا اختیار ہر صورت قائم رہتا ہے۔ نتائج پر اللہ کے اختیار کا نام ہی اس کی مشیت ہے۔ نتیجہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ شاہدین کے اتباع میں رضائے الہی کے مطابق اپنا حق ادا کرنے کے بعد نتیجے کو باذن اللہ (ارادہ الہی / مشیت الہی کے مطابق) ماننا بھی رضائے الہی پر عمل کا حصہ ہے۔ جو عمل ہم کرتے ہیں، اسکے رضائے الہی کے مطابق ہونے کیلئے ہم مسؤول ہیں۔ جو کچھ ہمارے ساتھ واقع ہوتا ہے، وہ اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ اسے باذن اللہ مانا ہماری ذمہ داری ہے۔

یہ نظریہ کہ اللہ تعالیٰ وجود مطلق ہے اور باقی ہر شے وجود مطلق کا عارضی انہصار، مسلم فکر کی تاریخ میں 'وحدت الوجود' یا *Doctrine of the unity/ oneness of all being* کہلاتا ہے۔ اس نظریہ کے دو بنیادی مفروضات میں سے ایک یہ ہے کہ 'الحق' اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ دوسرے بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ 'الله تعالیٰ وجود مطلق' ہے اور باقی سب کچھ اس کے اختیار کئے ہوئے عارضی تینیں (یعنی وجود اضافی) ہیں۔ 'وجود' عربی زبان کا لفظ ہے اور ووجہ دا اس کا مادہ ہے۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کیلئے قرآن پاک کی کسی آیت سے قطعاً اخذ ہوتا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو 'وجود مطلق' کہنا رسیجاً افتری (concoction) ہے۔ 'الحق' کو اسماء الحسنی میں شامل کرنا، قرآن پاک کی بعض آیات کی، حکمات سے تنقیح تعمیر کر کے، اس افتری کو بنیاد فراہم کرنے کی کوشش ہے۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ 'وحدت الوجود' مشاہدہ کا ایک مقام ہے، لیکن یہ لازم ہے کہ ہم اپنے مشاہدات کی وہ تعمیر کریں جو قرآن پاک سے ہم آہنگ ہو۔

ii) قدم "ق۔ د۔ م" کے مادہ سے عربی زبان کا لفظ ہے اور قرآن پاک میں یہ لفظ تین مرتبہ استعمال بھی ہوا ہے لیکن کہیں بھی یہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا اسم کو بیان کرنے کیلئے استعمال ہوا، نبی اللہ تعالیٰ کے صفاتی اسم کے طور پر کہیں سے اخذ ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کے تمیص کو ان کے حکم کے مطابق ان کے بھائی مصر سے لیکر روانہ ہوئے تو یعقوب علیہ السلام نے اپنے پاس والوں سے فرمایا: مجھے یوسف علیہ السلام کی خوشبو آرہی ہے اگر یہ نہ کہو کہ سٹھیا گیا ہوں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی ذریت سے جو لوگ آپ کے پاس تھے جھوٹوں نے یہ بات سنی: "کہنے لگے، خدا کی قسم! آپ اسی پرانے خط میں پڑے ہوئے ہیں۔" [قلالوا تَالَّهُ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالٍ كَفَرْتُ بِهِ] [12:95] کافر جب ایمان نہیں لاتے تو قرآن پاک کے بارے میں کہتے ہیں: "... یہ تو قدم جھوٹ ہے۔ ... هَذَا إِفْلَكْ قَدِيمٌ" [الاحقاف 46:11] اللہ نے چاند کیلئے مزریلیں ٹھہرائیں ہیں، چاند گھٹاٹا برھتار ہوتا ہے۔ فرمایا: "اور قمر کے لئے منازل ٹھہرائیں حتیٰ کہ قدیم شاخ کی طرح ہو گیا۔" (سورہ پیغمبر 39:36) جہاں یہ استعمال بھی ہوا ہے قطعاً ازیت (eternity) کے کسی بھی مفہوم میں استعمال نہیں ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے ذات و صفات پر ایسی اصطلاحات کے اطلاق کا کیا جواز ہے؟ اس سے کفیوں اور اختلاف کے سوا کیا حاصل ہو سکتا تھا!

iii) دانتیا نادانتہ طور پر غیر قرآنی اصطلاحات قبول کر لینے سے مسلم فکر میں الجھاد کیسے پیدا ہوتا ہے، اسکی وضاحت کیلئے ایک مثال پیش خدمت ہے۔

مسلم الہیات کے مسائل میں ایک مسئلہ ذات و صفات باری میں تعلق کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ

"کیا صفات باری، ذات باری سے الگ طور پر حقیقی اور زائد ذات ہیں یا ذات اور صفات میں عینیت پائی جاتی ہے یعنی ایک ہی ہیں۔"

انگریزی میں اسے اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔

"Are Divine Attributes real in their own right and superadded to the Being of God, or 'the Divine

Attributes are identical with the Being of God?'

مسلم متکلمین کے اشعری مکتب فکر کا موقف ہے کہ "صفات باری، ذات باری سے الگ طور پر حقیقی اور زائد ذات ہیں۔" "بجہہ معززہ مکتب فکر کا موقف ہے کہ "ذات باری اور صفات باری میں عینیت ہے۔" مسلم تہذیب کی پہلی صدی ہی میں یہ مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ آج تک مسلم فلسفہ اور کلام کے ماہر الزراع مسائل میں یہ موجود ہے۔ اسی مسئلہ پر ہونے والے مباحث سے آگے "خلق قرآن" سمیت کئی اور مسائل نے جنم لیا۔ مسلم فکر کی پوری تاریخ میں پروفیسر عبدالحمید کمالی (التومنی 2015ء) پہلے مفکر نظر آئے جنہوں نے انیں سو ساٹھ کی دہائی میں لکھے گئے اپنے تین قسطوں پر مشتمل سلسلہ مضامین میں اس مسئلے کے مأخذ کی درست نشاندہی کی اور قرآنی تناظر میں اسکا حل پیش کیا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کے بیان میں ایک مرتبہ بھی صفت کا لفظ استعمال نہیں کیا، نہ اپنے اسماء کیلئے "اسماء الصفة" کا لفظ استعمال کیا۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر بات کرنے میں مزید محاط رکھنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سُبْحَانَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ [سورة الصافات 37:180] "پاک ہے تیرارت، عزّت والارت، ان (صفات) سے جس کا اتصاف (یہ کافروں مشرک) اس کی ذات اقدس سے کرتے ہیں۔" مزید فرمایا گیا: اللہ لا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى [الإِنْجِيلُ إِنَّمَا يُنَادِيُ الْأَنْجِيلُ فَلَدُّهُ عَوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ سَيُجْزَوْنَ مَا كَلُوا اسماء الحسنی۔" (سورہ طہ 20:8) وَلَلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى

"يَعْمَلُونَ" اور اللہ کو اس کے اسماء الحسنی ہی سے پکارو۔ اور انہیں چھوڑ دو جو اس کے اسماء میں الحاد کرتے ہیں۔ وہ جلد ہی اپنے کئے کی جزا پائیں گے۔ "(سورہ الاعراف: 7: 180)

تمام غیر اسلامی فلسفے اور ادیان خدا کی ذات پر گفتگو کیلئے اس کی "ذات اور صفات" کی اصطلاحات کو ترجیح دیتے ہیں یا اس کے لئے ایسے صفاتی نام (القدیم، واجب الوجود، حقیقت مطلق، وجود مطلق، ineffable, immutable) تلقیل دیتے ہیں جو اللہ کی شان سے مناسبت نہیں رکھتے۔ قرآن پاک کے مطابق اسکے اسماء میں الحاد کے مترادف ہے۔ محلہ بالا آیات سورہ العصافات 3: 7، سورہ طہ 20: 8، اور سورہ الاعراف 7: 180 میں مسلمانوں کو اللہ کی ذات پر صفات کے حوالے سے گفتگو کے بجائے، اسکے اسماء الحسنی کے حوالے سے گفتگو کا اسلوب اختیار کرنے کا علم سکھایا گیا ہے۔ بعض لوگ (مشرکین، فلاسفہ، اور نام نہاد صوفیاء) جو اپنے فہم سے خدا کے ساتھ صفات منسوب کرتے ہیں، اللہ کے ان صفات سے پاک ہونے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اللہ کے لئے ایسے نام تلقیل دینے سے منع فرمایا گیا ہے جو قرآن پاک میں بیان کی گئی اسکی شان سے مناسبت نہیں رکھتے۔ قرآن پاک اللہ کے بہت سے اسماء الحسنی بیان کرتا ہے اور بہت سے مزید اسماء الحسنی، اسماء تو صیفی کی صورت قرآن پاک سے اخذ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی ایسا اسم پاک منسوب کرنا جو قرآنی اصولوں کے مطابق قرآن پاک سے اخذ نہ ہوتا ہو، اللہ کے اسماء میں الحاد ہے۔ مثلاً "الدَّهْرٌ"، "الْقَدِيمٌ" واجب الوجود وغیرہ بطور اسماء الحسنی قرآن پاک میں بیان ہوئے ہیں نہیں اخذ ہوتے ہیں۔

ارسطو کا فلاسفہ ہر شے کو ذات اور صفات (being & attributes) پر مشتمل قرار دیتا ہے۔ صفات، ذات شے سے الگ، اپنے طور پر حقیقتیں، یعنی زائد ذات ہیں۔ مسلم متكلمین معتزلہ اور اشاعرہ، دونوں مکاتب فکر نے عیسائیوں سے توحیدباری پر مباحثت کے دوران اللہ تعالیٰ پر ذات پاک اور اسماء الحسنی کی اصطلاحات میں گفتگو کا قرآنی اسلوب اختیار کرنے کی بجائے ان سے ذات پاک اور صفات باری کی غیر قرآنی اصطلاحات میں گفتگو کا فلاسفیانہ اسلوب نادانستہ طور پر قبول کر لیا۔ اشاعرہ نے موقف اختیار کیا کہ صفات باری، ذات باری سے الگ طور پر حقیقتی، اور زائد ذات باری ہیں۔ معتزلہ نے ذات و صفات کی عینیت کا موقف اختیار کر لیا۔ معتزلہ نے ذات و صفات کی عینیت کا موقف اسلئے اختیار نہیں کیا تھا کہ ان کے تزوییک یا اصطلاحات اور اسلوب غیر قرآنی تھا، بلکہ ان اعتراضات سے بچنے کیلئے اختیار کیا تھا جو اشاعرہ کے نظر یہ پرورد ہوتے تھے، اور ان کے پاس اسکا قابل الطینان دفاع نہیں تھا۔ ذات و صفات باری میں تعلق کا مسئلہ صدیوں سے معتزلہ اور اشاعرہ متكلمین، فلاسفہ اور صوفیاء کے درمیان مابہ الزراع ہے۔ غیر قرآنی اصطلاحات اور غیر قرآنی اسلوب میں اس کا مأخذ ہونے کا احساس ہونے، اور توحید باری کی قرآنی اصطلاحات اور قرآنی اسلوب میں تلقیل اور تلقیل دیکھاں الجھاؤ سے لکھنے میں، اللہ جانے ابھی کتنا عرصہ لگتا ہے۔ یہی حال ربط الحاد بالقدیم کے مسئلہ کا ہے۔ ہم وجدان کے ذریعہ علم ہونے کے مکر ہیں نہ کشف و شہود کے۔ شیخ اکبر حضرت محبی الدین ابن عربی کشف و شہود میں بہت بڑا مقام رکھتے ہیں۔ گیارہویں صدی عیسوی سے آج اکیسویں صدی تک ہزار سال میں، ہر زمانے میں آپ کے تبعین میں بھی بہت بڑے بڑے نام رہے ہیں۔

سورہ البقرہ کی آیت نمبر 50 میں فرمایا گیا ہے: "اور جب ہم نے موئی علیہ السلام سے چالیس رات کا وعدہ فرمایا، تو آپؐ کے کوہ طور پر تشریف لے جانے کے بعد تم نے، پھرے کو معبود بنالیا، اور تم ظالم تھے۔ پھر ہم نے تم پر عفو فرمایا اس کے بعد، کہ تم ٹکر کرو۔" (البقرہ: 50-51) حضرت آیت نمبر 54 میں ارشاد ہے: "اور جب موئی علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا، تم نے پھرے کو اخذ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے،... فَتُؤْبُوا إِلَى بَارِئِكُمْ فَأَفْتَلُوا أَنفُسَكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ ۝ لَكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ ۝ هُوَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ ۝ تَوَلَّنَّ بَعْدَ اِكْرَانِنَّ وَالَّذِي كَتَبَ لَكُمْ ۝ كَمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ ۝ هُوَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ ۝ تَوَلَّنَّ بَعْدَ اِكْرَانِنَّ وَالَّذِي كَتَبَ لَكُمْ ۝ يَهُ تَحْمَارَ بَعْدَ اِكْرَانِنَّ وَالَّذِي كَتَبَ لَكُمْ ۝" (البقرہ: 54) قرآن پاک میں قوم کا لفظ تجی کے ماننے اور نہ ماننے والے، دونوں کیلئے استعمال ہوا ہے۔ یہاں خطاب قوم کے ان افراد سے ہے جنہوں نے پھر اپنا ایسا اور اسے معبود مانا۔ جو حضرت ہارون علیہ السلام کی اطاعت اور اتباع میں رہے، انہوں نے تو اپنے اوپر ظلم نہیں کیا تھا۔ بعض مترجمین اور مفسرین نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: "...پس توہ کرو اپنے خالق کے حضور، اور قتل کرو اپنوں کو (جنہوں نے شرک کیا)۔" یا اس طرح کیا ہے "اور یاد کرو جب موئی نے اپنی قوم سے کہا: میری قوم کے لوگوں، تم نے یہ پھر اپنا کر اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اس لیے اب اپنے خالق کی طرف لوٹو اور (اس کے لیے) اپنے ان لوگوں کو (اپنے ہاتھوں سے) قتل کرو۔" اس کا ترجمہ "۔۔۔ پس (آپس میں) ایک دوسرے کو قتل کر ڈالو۔" بھی کیا گیا ہے۔ اپنے آپ کو مار ڈالنے کی توجیح کی دو ممکنہ صورتیں ہو سکتی ہیں: کہ انھیں خود ٹکری لینے کا حکم دیا گیا۔ کہ انہیں اپنے نبی پاک کی اطاعت اور اتباع کو اپنا عالٰ بناتے ہوئے من مانی سے رک جانے اور اس طرح اپنے نفس کو مار ڈالنے کا حکم دیا گیا۔ اس آیت میں اسکی توہ قبول کر لئے جانے کی سند موجود ہے۔ اس سے پہلے آیت نمبر 52 (ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعْنَكُمْ شَكُورُونَ ﴿٥٢﴾) میں ان سے عفو فرمائے جانے، اور شکریہ کا

موقع دئے جانے کی سند موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سند کی موجودگی میں **فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ** کے معنی اپنے آپ کو خود مار ڈالنا تو قطعاً نہیں ہو سکتے۔ اس کے معنی "اپنوں کو (جنہوں نے شرک کیا) کو قتل کرو۔" کے بھی نہیں ہو سکتے۔ پھر عفو فرمانے، شکریہ کا موقع دینے، متوجہ ہونے اور توبہ قول کرنے کے کیا معنی ہوئے؟ سورہ الاعراف میں مزید شہادت موجود ہے کہ پھرے کو معبود بنانے والوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی قریب نظر آئی تو وہ اپنے اعمال کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرمودات کی روشنی میں دیکھنے لگے۔ مگر اسی کا احساس ہوا، خسارہ احاطہ کرتا نظر آیا، پچھتاوے نے آلیا اور۔۔۔ کہنے لگے: اگر ہمارا رب ہمیں نہ بخشد تو یقیناً ہم خاسرین سے ہوئے۔" (الاعراف: 149:7) آگے ارشاد ہے: "بے شک جن لوگوں نے پھرے کو معبود بن لیا، انہیں حیات دنیا میں ان کے رب کی طرف سے غصب اور ذلت پہنچ گی، اور ہم مفترین کو ایسے ہی جزادیتے ہیں۔ اور جنہوں نے برے عمل کئے، پھر توبہ کی ان کے بعد، اور ایمان لائے، تو اس کے بعد بے شک تمہارا رب بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔" (الاعراف: 152:7-153) ان اسناد کی روشنی میں یہ بالکل واضح ہے کہ وہ پھرے کو معبود بنانے کا ویقیناً مگر اسی کے مرکب ہوئے، انہوں نے توبہ کی (سوائے سامری کے)، انکی توبہ قبول کر لی گئی، اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمادیا اور شکریہ کا موقع عنایت فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خواہشات کے خلاف رہنے کی نصیحت فرمائی اور تعلیم دی، **فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ** سے بھی مراد ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان پاک سے انہیں مگر اہ کہلوایا جانا، اور ان پر کفر، شرک، ارتداد کا لیبل نہ لگایا جانا، اور حضرت ہارون علیہ السلام کا پھرے کو معبود بنانے جانے کی شدید مگر اسی کے مقابله میں ترققہ کو بڑا آنہ قرار دینا اور ان کے معاملے میں ساکن ہو جانا، سب سے بڑی شہادت ہے کہ اس امر الہی کا مطلب اپنے آپ کو خود مار ڈالنا یا "اپنوں کو (جنہوں نے شرک کیا) کو مار ڈالنا" قطعاً نہیں ہو سکتا۔

اس کے باوجود بعض جیہد مترجمین اور مفسرین کرام اس تضاد سے اپنا دامن نہیں بچا سکے۔ **فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ کا "قتل کرو اپنوں کو (جنہوں نے شرک کیا)" کی صورت** میں ترجمہ و تفسیر کرنے میں لغت انکی مجبوری ہے۔ وہ بخشنے ہیں کہ "قتل" کے معنی لازماً کسی کو جان سے مار دینا ہی ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب "مسلم فکر کی قرآنی جہات" میں قرآن پاک سے نو اسناد پیش کی ہیں کہ "قتل" کے معنی لازماً جان سے مار دینا ہی نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ تضادِ کلام اللہ کے اندر نہیں، ان مترجمین اور مفسرین کے فہم میں ہے۔ (اللہ انھیں معاف فرمائے اور ان کے اخلاص کو قبول فرمائے۔)

ان مترجمین و مفسرین کے تضادات میں بتلا ہونے کا دوسرا سبب بعض مقامات پر اہل کتاب کی الہامی کتابوں سے اثر قبول کرنا یا اپنے نظریات کی تثبیت اور ہم آہنگی کو پیش نظر رکھنا ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ "اہل کتاب کی الہامی کتابیں تحریف شدہ ہیں۔" (القرآن، 4:46، 2:75) سورہ العنكبوت کی آیت مبارکہ: "اور اہل کتاب سے مجادلہ نہ کرو مگر بطریق احسن، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ان میں سے ظلم کیا، اور کہو کہ ہم اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل ہوا، اور جو تمہاری طرف نازل ہوا، اور ہمارا اور تمہارا اللہ ایک ہی ہے، اور ہم اسی کو مانتے ہیں۔" (القرآن، 29:46) کے ذریعے مسلمانوں کو اہل کتاب سے مکالمہ کا اصول یہ دیا گیا ہے کہ "اگر وہ اپنی کتاب کے حوالے سے کوئی بات کریں اور وہ قرآن پاک سے صریح امتناع قض نہ بھی ہو تو اگر کسی بات کی تصدیق سے احتراز کرنا بھی ویسے ہی ضروری ہے جیسے کہ اگلی بات کی تردید ہے۔" یہ کہنے کا حکم ہے کہ: "ہم ایمان لائے اس پر جو ہماری طرف نازل ہوا، اور جو تمہاری طرف نازل ہوا، اور ہمارا اور تمہارا اللہ ایک ہی ہے، اور ہم اسی کو مانتے ہیں۔" یہ تفسیر قرآن کا ایک قرآنی اصول ہے۔ⁱⁱⁱ ظاہر ہے کسی فرمان الہی کی خلاف ورزی سے، وہ دانستہ ہو یا نادانستہ، کبھی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچا جا سکتا۔